فہرست

شذرات	پہلے مسلمان......	محمد بلال	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۱۵۸-۱۶۲)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	تقدیر کا لکھا ہونا۔ تقدیر کا دائرۂ اثر	طالب محسن	۱۱
دین و دانش	قانون جہاد (۸)	جاوید احمد غامدی	۱۹
	اجتہاد	جاوید احمد غامدی / منظور الحسن	۲۵
نقطۂ نظر	دستاویزات بحیرۂ مردار (۱)	احسان الرحمٰن غوری	۳۵
حالات و وقائع	دیوبند کانفرنس اور مذہبی سیاست	خورشید احمد ندیم	۴۷
	طالبان کی بت شکنی	ڈاکٹر محمد فاروق خان	۵۱
	مولانا عبدالرحمٰن نگرانی ندوی	اختر حسین عزمی	۵۷
	دانش سرا کا تیسرا سالانہ کنونشن	محمد بلال	۶۱
ادبیات	مے خانہ	جاوید احمد غامدی	۷۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پہلے مسلمان ......

۱۳ اپریل ۲۰۰۱ کو لاہور کے ایک ہوٹل میں تیسری پنجابی عالمی کانفرنس شروع ہوئی جو ۱۶ اپریل کو اختتام پزیر ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ اس میں پنجاب، پنجابیوں اور پنجابی زبان کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا جائے، موجودہ صدی کے لیے امن، محبت اور دوستی کا پیغام دیا جائے، ادب اور ثقافت کے ذریعے سے پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کا خاتمہ کیا جائے اور امن واخوت کی فضا پیدا کی جائے۔

بلاشبہ یہ مقاصد لائقِ تحسین ہیں۔ دینی، ملی، ملکی غرض یہ کہ کسی بھی پہلو سے ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی مادری زبان سے محبت کرنا، اس کے فروغ کے لیے کام کرنا بالکل قابلِ فہم ہے۔ ہر شخص کو اپنی مادری زبان سے محبت ہوتی ہے اور یہ محبت بالکل فطری ہوتی ہے۔ ایسی کانفرنسوں کا انعقاد سندھی، پٹھان اور بلوچی حضرات کو بھی کرنا چاہیے۔ یہ سب انسان کی پہچانیں ہیں۔ ان پہچانوں کو دین بھی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن پہچان کو پہچان ہی کی سطح پر رکھنا چاہیے، اسے انسان کی حقیقت پر غلبہ نہیں پانا چاہیے۔

مگر حضرتِ انسان کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ کم ہی حدود کے اندر رہ پاتا ہے۔ پنجابی کانفرنس میں بھی ایسے ہی ہوا ہے۔ اس کانفرنس کے اصل موضوع اور مقصد سے ہٹ کر دسرے مسائل پر بھی اظہار خیال کر دیا گیا۔ بالفاظِ دیگر کچھ دوسرے مسائل بھی پیدا کر دیے گئے، جس سے عالمی سطح پر امن واخوت کی فضا پیدا ہونے کے بجائے پاکستان ہی میں بدامنی اور لڑائی جھگڑے کی فضا پیدا ہوگئی۔

اس کانفرنس میں یہ کہہ دیا گیا کہ: ''مذہب بہت بڑا سچ ہے مگر پنجابیت مذہب سے بھی بڑی سچائی ہے۔ اور مذہب پنجابیت کے راستے میں دیوار نہیں بن سکتا، ہم پہلے پنجابی پھر ہندو، مسلمان اور سکھ ہیں'' ...... ''سرحد کے دونوں طرف بسنے والے پنجابی ایک ہی تہذیب وثقافت کا حصہ ہیں'' ...... ایک پاکستانی دانش ور حمید اختر نے کہا: ''پاکستان تلاوتیں کرنے کے لیے نہیں بلکہ ترقی کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔''

اس قسم کے کچھ اور خیالات کا بھی اظہار کیا گیا۔ اس پر ہمارے مذہبی رہنماؤں نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا: ''پنجابی زبان کو نظریۂ پاکستان کے مقابلے میں لانا غداری ہے۔'' ...... ''ملک دشمن طرح طرح کے فتنے اٹھا رہے ہیں۔'' ...... ''یہ کانفرنس کشمیریوں کے خون کا مذاق اڑانے کے لیے بلائی گئی ہے۔'' ...... ''پنجابی زبان کے نام پر علاقائی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جذبات کو ابھارنے اور نظریۂ پاکستان کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' مذہب پسند دانش وروں نے یہ لکھا ہے: ''جس کا پیسہ لگے گا اسی کی مرضی کی بات ہوگی، بھارت نے منظّم طریقے سے ایسے ادارے، تنظیمیں اور انجمنیں قائم کر رکھی ہیں جو بظاہر تو غیر سیاسی ہیں، لیکن کام ان سے وہی لیا جاتا ہے جو پاکستان کے خلاف بھارت کی طے شدہ پالیسیوں کو آگے بڑھاتا ہے۔'' ...... ''مجھے پنجابی زبان سے عشق ہے مگر میں پہلے پاکستانی ہوں پھر پنجابی ہوں۔ میرے گھر کے اندر میری بیوی کے پنجابی افسانوں کا مجموعہ ''اک اوپری کڑی'' پنجابی زبان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے مگر وہ پہلے پاکستانی اور پھر پنجابی ہے۔''

اسی طرح کے کچھ اور کالم بھی لکھے گئے ہیں، جن میں اس کانفرنس کے اصل محرکات سیاسی قرار دیے گئے اور اس کانفرنس کو بھارت کی ایک سازش ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس ردِعمل کا بھی ایک ردِعمل ہوا۔ کانفرنس کے چیئرمین فخر زمان نے کہا کہ: ''اس کانفرنس کی مخالفت کرنے والے مولویوں کو پنجاب میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ جلد از جلد پنجاب چھوڑ دیں ورنہ ہم انھیں زبردستی پنجاب سے نکال دیں گے۔''

پھر یہ سلسلہ مزید آگے چلا۔ مسجد شہدا، لاہور کے سامنے مختلف مذہبی جماعتوں نے ایک مظاہرہ کیا۔ حکومت کی طرف سے پنجابی کانفرنس کے منتظمین کے خلاف ابھی تک کارروائی نہ کرنے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس مظاہرے میں یہ کہا گیا: ''قرآن وسنت کی توہین کی دفعہ لگا کر پنجابی کانفرنس کے منتظمین کو گرفتار کر لیا جائے۔'' ...... ''ان کی گرفتاری تک احتجاج جاری رہے گا۔ آیندہ پنجابی کانفرنس کو زبردستی روکیں گے۔'' اور یہ اعلان کیا گیا کہ: ''فخر زمان اور حمید اختر کا نہ تو جنازہ پڑھایا جائے گا، نہ ان کے جنازے میں شرکت کی جائے گی اور نہ انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے دیا جائے گا۔''

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اختلاف کتنی جلدی ''مخالفت'' بن جاتا ہے اور پھر ''مخالفت'' سے معاملہ کتنی جلدی خوں ریزی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

اس طرح کا رویہ اگر روایتی دانش ور اختیار کریں تو افسوس تو ہوتا ہے مگر کم۔ اس لیے کہ روایتی دانش وروں کا تصورِ دین بہت ناقص ہوتا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں ان کے خیالات حقیقت سے بہت دور ہوتے ہیں۔ خدا اور اس کی ہدایت کو وہ کوئی شعوری اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اخروی پرسش جو انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، ان کے نزدیک سرے سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے کسی بھی وقت اور کسی بھی قسم کی جہالت، حماقت اور ضلالت کے صادر ہونے کا پورا امکان موجود ہوتا ہے۔ مگر جب اہلِ مذہب ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں، اختلافی بات سن کر سخت کلامی پر اتر آتے ہیں، قطعی ثبوت کے بغیر کسی پر غداری کا الزام لگا دیتے ہیں، تفتیش کے بغیر کسی کے سازشی ہونے کا فیصلہ دے دیتے ہیں تو افسوس ہی نہیں، دکھ بھی ہوتا ہے۔

اور ایسا رویہ اختیار کرنے سے سب سے زیادہ نقصان بھی انھی کا ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ

سخت کلام اور سخت مزاج ہیں۔ پھر لوگ ان کے قریب آنے سے گریز کرتے ہیں، بلکہ یہ گریز فطری طور پر آپ سے آپ لوگوں کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ معاشرے میں دین سے دوری کی شکل میں نکلتا ہے۔ اس صورتِ حال کے سب سے زیادہ ذمہ دار بہرحال علماے دین، مذہبی رہنما اور مذہبی دانش ور ہی قرار پائیں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی معاشرے میں سب افراد ایک ہی فکر کے حامل نہیں ہوتے، وہ مختلف طریقے سے سوچتے ہیں، وہ مختلف معیارات قائم کرتے ہیں، مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں، مختلف آرا اختیار کرتے ہیں اور ان آرا کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ایسا ماضی میں بھی ہوتا رہا ہے، آج بھی ہو رہا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال سے گھبرا جانا اور مشتعل ہو جانا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ فکری نوعیت کے اختلافات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ ان کی جڑیں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ ایسے اختلافات کو کسی ''گالی'' یا ''الزام'' سے ختم یا کم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مذہب کے خلاف بات کرے تو گھبرانا نہیں جانا چاہیے۔ مذہب ایک بہت بڑی چٹان ہے۔ اس کے خلاف کی جانے والی باتوں کی حیثیت محض خشک پتیوں کی سی ہے، جو چٹان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

مذہب ایک ایسی کائناتی سچائی ہے جو ملک، صوبے، زبان غرض یہ کہ ہر چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ہم پہلے مسلمان ہیں، اس کے بعد پاکستانی اور پھر پنجابی ہیں۔ بالفاظِ دیگر خدا پہلے ہے اور اس کے بعد خدائی ہے۔ قدرت پہلے ہے اور اس کے بعد فطرت ہے۔ خالق پہلے ہے اور اس کے بعد مخلوق ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نابینا کو بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی گواہی انسان کے اندر اور باہر، ساکن اور متحرک ہر شے دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو محض کوئی فکری بات نہیں ہے بلکہ اس کے انکار پر انسان کو بڑی دردناک سزا مل سکتی ہے۔

وہ لوگ جو سچے ''حقیقت پسند'' ہیں، انھوں نے کبھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا۔ انھوں نے ہمیشہ اس حقیقت کے مطابق اپنی ترجیحات کی فہرست کو مرتب کیا۔ مذہب نے تقاضا کیا تو اپنا ملک چھوڑ دیا۔ ہجرت کا مشکل سفر اختیار کر لیا۔ اپنے ہم زبان چھوڑ دیے۔ اپنے ہم ثقافت چھوڑ دیے۔ اپنے ماں باپ چھوڑ دے۔ ابراہیم خلیل اللہ انتہائی نرم دل انسان تھے مگر جب ان پر کھلا کہ ان کے والد خدا کے دشمن ہیں تو آپ نے انھیں چھوڑ دیا۔

صدیق و فاروق، عثمان و علی کی زبان عربی تھی۔ ابوجہل، ابولہب اور عبداللہ بن ابی کی زبان بھی عربی ہی تھی، مگر دنیا جانتی ہے کہ مذہب نے اس اشتراک کے باوجود انھیں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف کر دیا تھا۔ اسی چیز کو دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ ایرانی، ترکی، سعودی، افغانی مختلف زبانیں بولتے ہیں مگر اس کے باوجود ایک مذہب ہونے کے باعث اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔

پنجاب اور پنجابی سے بات چلی ہے۔ ہم پنجاب اور پنجابی کی بات کرتے ہیں۔ بے شمار پنجابی مسلمان ہیں جو مکہ اور مدینہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جانے کے لیے بے تاب ہیں۔غریب ہوں تو اس کے لیے پائی پائی جوڑتے ہیں۔اس معاملے میں حکومتِ پاکستان کے پاس درخواستوں کی مقدار اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اسے قرعہ اندازی کرنا پڑتی ہے۔آج کل تو سفر محفوظ ہو گئے ہیں، پہلے لوگ بحری جہاز کے ذریعے سے عرب جاتے تھے اور سچی بات ہے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر جاتے تھے۔حالانکہ مکہ اور مدینہ کے باسیوں کی زبان مختلف ہے۔تہذیب اور تمدن کے بہت سے مظاہر مختلف ہیں اور پنجاب اور مکہ کے مابین غیر معمولی فاصلے حائل ہیں۔

اب غور کریں، کتنے پنجابی مسلمان ہیں جو اسی طرح امرتسر اور جالندھر جانے کے لیے بے تاب ہیں۔حالانکہ یہ شہر مکہ اور مدینہ کی نسبت بہت قریب ہیں۔وہاں جانے کے لیے اخراجات بھی کم درکار ہیں۔زبان بھی ایک ہے۔تہذیب وتمدن کے بعض مظاہر بھی ملتے جلتے ہیں۔پھر ایک اور زاویے سے غور کریں بلکہ مشاہدہ کر کے دیکھ لیں، دیوبندی پنجابی، بریلوی پنجابی کی نسبت دیوبندی پٹھان سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں۔اسی طرح تصوف کا قائل پنجابی، تصوف کے ناقد پنجابی کی نسبت تصوف کے قائل سندھی کو زیادہ اپنا اپنا سمجھتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ مذہب ایک سمندر ہے اور علاقائی زبانیں اور ثقافتیں ندی نالے ہیں۔ندی نالوں کو سمندر پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔جو لوگ ندی نالوں کو سمندر پر ترجیح دیتے ہیں، اصل میں ان کے فکر میں کوئی بنیادی خرابی پائی جاتی ہے۔اس صورتِ حال میں اگر فرض کر لیا جائے کہ ان لوگوں کے پیچھے غیر ملکی ایجنسیاں ہیں تو اوپر مذکور رویہ اختیار کرنے سے کیا ہوگا؟ اس سے یہ ہوگا کہ انھیں کوئی سزا ہو جائے گی یا وہ اپنی بات کھل کر کرنے سے گریز کریں گے۔پھر وہ اپنا باطن چھپا لیں گے، معاشرے میں منافق بن کر رہیں گے اور خفیہ طریقے سے کارروائیاں کریں گے، جو ظاہر ہے کہ زیادہ سنگین صورتِ حال ہوگی۔

اس لیے اس معاملے میں بہتر حکمتِ عملی یہ ہے کہ انھیں کھل کر بات کہنے کی آزادی دی جائے۔جب یہ کھل کر اور تفصیل کے ساتھ بات کریں گے، تو ان کی پوری بات سامنے آئے گی، ان کی اصل دلیل واضح ہوگی اور دلیل کی بنیاد نمایاں ہوگی۔اس کے بعد فکری طریقے سے اس کی بنیاد کو ہدف بنایا جائے۔اس کی بنیاد کو ڈھانے کی کوشش کی جائے۔اس سے ان لوگوں کے نظریات کمزور ہو جائیں گے۔وہ ان کے ذریعے سے مزید لوگوں کو متاثر نہ کر سکیں گے۔یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ انسان بنیادی طور پر مسلمان پیدا ہوتا ہے۔مذہب اس کے ریشے ریشے میں رچا بسا ہوتا ہے، مگر غلط ماحول اور غلط فکر اسے غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں۔عین ممکن ہے کہ فکری اصلاح ہو جانے کے بعد ایسے لوگوں کے اگر بالفرض غیر ملکی ایجنسیوں سے رابطے ہوئے بھی تو یہ خود انھیں ختم کر دیں۔اور یوں مسئلے کے جڑ بنیاد سے حل ہونے کے قوی امکانات پیدا ہو جائیں۔

——— محمد بلال

www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۳۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

(بیت الحرام ہی کی طرح صفا و مروہ کی حقیقت بھی اِن یہودیوں نے ہمیشہ چھپانے کی کوشش کی ہے، لہٰذا تحویلِ قبلہ کے اِس موقع پر یہ بات تم پر واضح ہونی چاہیے کہ) صفا اور مروہ[۳۹۹] یقیناً اللہ کے شعائر[۴۰۰] میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اِس گھر کا حج یا عمرہ کرنے کے لیے آئیں، اُن پر کوئی حرج نہیں[۴۰۱] کہ وہ اِن کا طواف[۴۰۲] بھی کر

---

[۳۹۹] صفا و مروہ بیت اللہ کے پاس وہ دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج و عمرہ کے موقع پر سعی کی جاتی ہے۔ اصل قربان گاہ جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند کو قربانی کے لیے پیش کیا، وہ چونکہ یہی مروہ ہے، اس لیے یہود نے اپنے صحیفوں میں اس کا تعلق بھی ان سے کاٹ دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کی تفصیلات امام حمید الدین فراہی کی کتاب، ''الرای الصحیح فی من ہوالذبیح'' میں دیکھ لی جاسکتی ہے۔

[۴۰۰] یہ شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور رسول کی طرف

يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ
يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ

لیں، (بلکہ یہ ایک نیکی کا کام ہے) اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا[۴۰۳]، اللہ اُسے قبول کرنے والا ہے، اُس سے پوری طرح باخبر ہے[۴۰۴]۔ (اِس معاملے میں) جو حقائق ہم نے نازل کیے اور جو ہدایت بھیجی تھی[۴۰۵]، اُسے جو لوگ چھپاتے ہیں، اِس کے باوجود کہ اِن لوگوں کے لیے اپنی کتاب[۴۰۶] میں ہم نے اُسے کھول کھول کر بیان کر دیا تھا، یقیناً وہی ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی جن پر لعنت کریں گے۔ (اِن میں سے) البتہ، جو توبہ کریں اور اپنے اِس طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں[۴۰۷] اور جو کچھ چھپاتے تھے، اُسے صاف

سے کسی حقیقت کا شعور قائم رکھنے کے لیے بطور ایک نشان کے مقرر کیے گئے ہوں۔ چنانچہ قربانی جس طرح حقیقتِ اسلام کی علامت ہے، حجرِ اسود کا استلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و میثاق کی علامت ہے، رمیِ جمرات شیطان کے خلاف جنگ اور اس پر لعنت کی علامت ہے، اسی طرح صفا و مروہ کی سعی اپنے پروردگار کے لیے اس غلامانہ سرگرمی کی علامت ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت دکھائی جب وہ اسمٰعیل کو صفا سے مروہ کی طرف لائے اور انھیں قربانی کے لیے اس پر لٹا دیا۔ ان شعائر میں اصل مطمحِ نظر تو وہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں جن کی یہ علامت ہوتے ہیں، لیکن انھی حقیقتوں کے تعلق سے یہ شعائر بھی دین میں تقدس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ تاہم یہ بات ان کے بارے میں ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ جو حقیقتیں ان میں مضمر ہوتی ہیں، وہ اگر لوگوں کے دل و دماغ میں زندہ نہ رہیں تو ان شعائر کی حیثیت روح کے بغیر ایک قالب سے زیادہ کی نہیں رہتی۔ اسی طرح یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ تمام شعائر اللہ اور رسول کے مقرر کردہ ہیں اور ان کی تعظیم کے حدود بھی اللہ و رسول نے ہمیشہ کے لیے طے کر دیے ہیں، لہٰذا اب کوئی شخص نہ اپنی طرف سے ان میں کوئی اضافہ کر سکتا ہے اور نہ ان کی تعظیم کے حدود میں کسی نوعیت کی کوئی تبدیلی کر سکتا ہے۔ اس طرح کی ہر چیز ایک بدعت ہوگی جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہے۔

[۴۰۱] یہ اس لیے فرمایا ہے کہ یہود نے جب صفا و مروہ کا تعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کاٹ دینے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ یہ بات بھی لازماً کہی ہوگی کہ ان پہاڑیوں کے درمیان سعی محض ایک مشرکانہ بدعت ہے، دینِ ابراہیمی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن نے یہ اسی کی تردید میں واضح کیا ہے کہ ان کا طواف کر لینے میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مشروع عبادت ہے اور اس لیے یقیناً نیکی اور خیر کا کام ہے جو اگر شوق سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا۔

[۴۰۲] اس سے مراد وہ سعی ہے جو ان پہاڑیوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اسے طواف کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا ہے

اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَا تُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ

صاف بیان کر دیں[۴۰۸] تو اُن کی توبہ میں اپنی شفقت سے قبول کرلوں گا[۴۰۹] اور (حقیقت یہ ہے کہ) میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں، میری شفقت ابدی ہے۔ ۱۵۸-۱۶۰

(اِس کے برخلاف) وہ لوگ جو اپنے انکار پر قائم رہے اور مرے تو اِسی طرح منکر تھے،[۴۱۰] یقیناً وہی ہیں جن

کہ اس کی صورت، اگر غور کیجیے تو طواف سے کچھ ملتی جلتی ہوتی ہے۔

[۴۰۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی صرف حج وعمرہ کے موقع پر کی جا سکتی ہے اور اس موقع پر بھی یہ ایک نفل عبادت ہے جو اگر کی جائے تو باعثِ اجر ہوگی۔ یہ حج وعمرہ کے لازمی مناسک میں سے نہیں ہے۔

[۴۰۴] اصل میں لفظ 'شاکر' استعمال ہوا ہے۔ یہ عربی زبان کے ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی نسبت کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ نسبت اگر بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی شکر گزاری کے ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف ہو تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

[۴۰۵] یعنی وہ حقائق جو اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبر کی بعثت سے متعلق پرانے صحیفوں میں نازل کیے اور جو ہدایت بالخصوص ان کے باب میں بھیجی تھی۔

[۴۰۶] یعنی تورات میں۔

[۴۰۷] اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ توبہ اس وقت تک معتبر نہیں ہے، جب تک آدمی اس غلطی کی اصلاح نہ کر لے جس کا ارتکاب اس نے کیا ہے۔

[۴۰۸] یعنی آخری نبی کے بارے میں تورات کے جو حقائق یہود نے چھپائے ہیں، انھیں ظاہر کر دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک کم سے کم یہود کے علما وخواص ان تحریفات سے بے خبر نہیں تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق تورات اور دوسرے صحیفوں میں کی گئی تھیں۔

[۴۰۹] اصل میں '**اتوب علیهم**' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں '**اتوب**' کے ساتھ '**علی**' کا صلہ دلیل ہے کہ اس میں رحمت کا مفہوم متضمن ہے۔ آگے '**انا التواب الرحیم**' کہہ کر قرآن نے اسے واضح کر دیا ہے۔

[۴۱۰] مطلب یہ ہے کہ اپنی ضد پر اڑے رہے، نہ توبہ واصلاح کی توفیق ہوئی اور نہ حق کے اعلان واظہار کی۔ اس سے محروم ہی دنیا سے اٹھ گئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

پر اللہ اور اُس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔[۴۱۱] وہ اِس میں ہمیشہ رہیں گے،[۴۱۲] نہ اُن کی سزا میں کمی کی جائے گی اور نہ اُنھیں کوئی مہلت ہی ملے گی۔ ۱۶۱۔۱۶۲

[۴۱۱] یہ اس اجمال کو واضح کر دیا ہے جو اوپر '**یلعنهم اللعنٰون**' کے الفاظ میں موجود تھا۔

[۴۱۲] یعنی اس عذاب میں، جہاں وہ ڈالے جائیں گے۔

(باقی)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

طالب محسن

تقدیر کا لکھا ہونا

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۷۹۔۸۰)

عن عبد اللّٰہ بن عمرو رضی اللّٰہ عنه قال : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم : کتب اللّٰہ مقادیر الخلائق قبل أن یخلق السموات و الارض بخمسین الف سنة ۔ قال : کان عرشه علی الماء ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں۔ آپ نے فرمایا: اس وقت عرش پانی پر تھا۔''

لغوی مباحث

مقادیر: یہ 'مقدار' کی جمع ہے۔ 'مقدار' کا مطلب پیمانہ ہے۔ قرآنِ مجید میں آیا ہے: 'و کل شیء عنده بمقدار'[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کے لگے بندھے ضابطے، معین پیمانے اور مقرر اوقات ہیں۔ یعنی

لوگوں کی خواہشات پر ان میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔

عرش : قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے '**عرش**' کا لفظ اقتدار کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس تخت کے لیے بھی جس پر بیٹھا جاتا ہے۔لیکن اس کی کیفیت یا ماہیت متعین کرنا ہمارے دائرۂ علم سے باہر ہے۔

الماء : پانی۔مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے میں اس جملے میں زمین کے اس دور کا ذکر ہوا ہے۔جب ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور کہیں بعد میں برِ اعظم نمودار ہوئے۔

متون

اس روایت کے متون میں کچھ فرق محض لفظی ہیں۔مثلاً بعض روایات میں '**مقادیر الخلائق**' کے بجائے '**مقادیر الخلق کلهم**' یا '**مقادیر الخلائق کلهم**' درج ہے۔اسی طرح کچھ راویوں نے '**کتب اللّٰہ مقادیر الخلائق**' کی جگہ صرف '**قدر اللّٰہ المقادیر**' سے یہ مضمون ادا کر دیا ہے۔

اس روایت میں ایک آیت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔پورا جملہ '**کان عرشہ علی الماء**' ہے کئی روایات میں اس کا حوالہ '**کان**' کے بغیر دیا گیا ہے۔

البتہ، مسلم کی تصریح ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔انھوں نے بیان کیا ہے کہ بعض روایات میں اس آیت کا حوالہ ہی نہیں ہے۔آیت کے معنی پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس روایت سے غیر متعلق ہے۔لہٰذا قرینِ قیاس یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حوالہ نہ دیا ہو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معنی

اس روایت کے محلِ غور نکات تین ہیں۔ایک یہ کہ مقادیر سے کیا مراد ہے؟ دوسرے یہ کہ پچاس ہزار سال کی مدت کے بیان سے کیا چیز معلوم ہوتی ہے۔تیسرے یہ کہ '**کان عرشہ علی الماء**' کا کیا مفہوم ہے اور کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلی تخلیق کی گئی چیز پانی ہے۔

سب سے پہلے روایت کے پہلے جملے کو دیکھیے۔اس میں جو چیز بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق سے بہت پہلے تمام منصوبہ پوری تفصیل کے ساتھ لکھ دیا تھا۔اس تفصیل کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں ایک ایک پتے، ایک ایک ذرے اور ہر خشک وتر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ رجسٹر میں درج ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ وَ يَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ وَ مَا

"اور اس کے پاس غیب کی چابیاں ہیں۔اسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔وہ جانتا ہے جو خشکی اور تری میں

---

۱ الرعد۱۳:۸۔

تَسۡقُطُ مِنۡ وَرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَ حَبَّةٍ فِيۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ۔ (الانعام ٦:٥٩)

ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا، مگر وہ اس سے واقف ہوتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی بیج نہیں اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے جو ایک کتابِ مبین میں نہ ہو۔''

جو بات اس روایت میں بیان ہوئی ہے، وہ بطورِ اصول قرآنِ مجید میں بھی مذکور ہے۔ سورۂ قمر میں ہے:

اِنَّا كُلَّ شَيۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ۔ (٥٤:٤٩)

''لاریب، ہم نے ہر چیز کو ایک مقرر پیمانے پر پیدا کیا ہے۔''

ان آیات اور زیرِ بحث روایت کے الفاظ کو سامنے رکھیں تو یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ مدعاے کلام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق سے بہت پہلے اس کی تمام اشیا کے بارے میں تفصیلات لکھ دی تھیں۔ یہ تفصیلات ظاہر ہے کہ ہر پہلو سے تھیں۔ یعنی ان کی ساخت، خصوصیات، ان سے متعلق واقعات، ان کے وجود میں آنے اور معدوم ہونے کا وقت وغیرہ۔ غرض یہ کہ جو کچھ ظہور میں آنا ہے اور جو کچھ وجود میں لایا جائے گا، لکھ دیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت اذہان میں راسخ ہو اور وہ علمِ الٰہی کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔

اس سے ہمارے لیے یہ عظیم حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ہماری زندگی کا ایک ایک پہلو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ ہم آج کیا کر رہے ہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں آج ہی نہیں آ رہی ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں بہت پہلے سے ہے اور زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی گئی تھی۔ جب یہ بات ہم پر واضح ہوتی ہے تو ہمارا اللہ تعالیٰ پر یقین و اعتماد مزید قوی ہو جاتا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہے کہ زمین و آسمان کا کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ کے لیے نیا نہیں ہے، ہمارے ساتھ ہونے والا کوئی معاملہ اس کی بے خبری میں نہیں ہوتا، اس کائنات کا کوئی گوشہ اس سے چھپا ہوا نہیں ہے، جو کچھ وقوع پزیر ہو رہا ہے، اس کے ہاں لکھا ہوا ہے تو ہم کسی اندیشے میں کیوں مبتلا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے یقیناً اپنے ازلی علم کی بنیاد پر ہماری دستگیری کا سامان بھی کر رکھا ہے۔

اس جملے میں بیان کی گئی دوسری چیز پچاس ہزار سال کی مدت ہے۔ یہ ایک خبر ہے اور اگر روایت بیان کرنے میں یا سمجھنے میں راوی سے غلطی نہیں ہوئی تو اس خبر کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی جب تک کسی قوی دلیل سے یہ بات واضح نہیں ہو جاتی کہ یہ اطلاع درست نہیں ہے، ہم اسے صحیح سمجھیں گے۔ قرآنِ مجید میں مقادیر کے ایک کتابِ مبین میں لکھے جانے کا ذکر تو متعدد مرتبہ ہوا ہے، لیکن اس کے لکھے جانے کا زمانہ بیان نہیں ہوا۔

اس اطلاع کا معنوی پہلو ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔ بعض شارحین نے یہاں یہ کلامی نکتہ پیدا کیا ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ پچاس ہزار سال پہلے آئی تھیں یا ہمیشہ سے تھیں اور یہاں صرف لکھنے کا زمانہ بتایا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک، اللہ تعالیٰ کی

ذات وقت اور جگہ یعنی زمان و مکان کے پیمانوں سے ماورا ہے۔ ہم چونکہ زمان و مکان کے اسیر ہیں اور انھی پیمانوں سے سوچنے کے عادی ہیں، لہٰذا ہمارے فہم کی تقریب کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان الفاظ سے اس کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرنا اپنی حدود سے تجاوز ہے۔

تیسرا اہم نکتہ 'کان عرشه علی الماء' سے متعلق ہے۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قرآنِ مجید میں یہ کس مفہوم میں آیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید کا وہ مقام، یہ جملہ جس کا حصہ ہے اس طرح سے ہے:

وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزۡقُهَا وَ یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا، کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ۔ وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرۡشُهٗ عَلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا، وَ لَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ۔ (ہود ۱۱: ۶۔ ۷)

''اور زمین کے ہر جان دار کا رزق اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ اور وہ جانتا ہے اس کے ٹھکانے اور مدفن کو۔ ہر چیز ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ تمھیں جانچے کہ کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔ اور اگر تم کہتے ہو کہ مرنے کے بعد تم لوگ اٹھائے جاؤ گے تو یہ کافر یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔''

ان آیات میں زمین و آسمان سے پہلے کے معاملات زیرِ بحث ہی نہیں ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ ان کے معاملات کو کس طرح سے چلاتے چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی نے اسے زمین ہی کے اوپر گزرنے والا ایک دور قرار دیا ہے:

> ''و کان عرشه علی الماء'۔ 'عرش' خدا کی حکومت کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کرۂ ارض کی خشکی نمودار ہونے سے پہلے پہلے یہ سارا کرہ مائی تھا اور اللہ کی حکومت اس پر تھی۔ پھر پانی سے خشکی نمودار ہوئی اور زندگی کی مختلف النوع انواع وجود میں آئیں اور درجہ بدرجہ پورا عالمِ ہستی آباد ہوا۔ یہی بات تورات میں بیان ہوئی ہے، اگرچہ اس کے مترجموں نے مطلب خبط کر دیا ہے۔ کتابِ پیدایش کی پہلی ہی آیت میں یہ الفاظ ہیں: اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر گردش کرتی تھی۔'' (تدبرِ قرآن، ج ۴، ص ۱۰۹)

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی اس تصریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنِ مجید کے اس جملے کا زیرِ بحث روایت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اضافہ، قرینِ قیاس یہی ہے کہ کسی راوی نے کیا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اس کا سبب جمعِ حدیث کے زمانے میں اس تفسیری رائے کا مقبول ہونا بنا ہے۔ غرض یہ کہ ہمارے نزدیک، اس روایت کے وہ متون ہی صحیح ہیں جن میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ جملہ روایت نہیں ہوا۔

کتابیات

ابنِ کثیر ج ۲، ص ۲۶۹۔ اعتقاد اہل السنہ، ج ۴، ص ۵۷۹۔ القدر، ج ۱، ص ۱۰۱۔ تحفۃ الاحوذی، ج ۶، ص ۳۰۷۔ مسلم، کتاب القدر، باب ۶۔ سننِ ترمذی، کتاب القدر، باب ۱۴۔ مسندِ احمد، مسند عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

تقدیر کا دائرۂ اثر

عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہ قال : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: کل شیء بقدر حتی العجز و الکیس ۔

''حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز مقدر کر دی گئی ہے، یہاں تک کہ بے چارگی اور ہوشیاری بھی۔''

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

قدر : مقدار، اندازہ، طے شدہ شرح۔

حتی : یہ یہاں حرفِ جار کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

عجز : درماندگی و بے چارگی۔ کسی معاملے یا عمل کو کسی بھی سبب کے تحت نہ کرنے کی حالت میں ہونا۔

الکیس : یہ لفظ سمجھ داری کے معنی میں بھی آتا ہے اور چستی اور چالاکی کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ دوسرے معنی زیادہ موزوں لگتے ہیں۔

متون

صاحبِ مشکوٰۃ نے اس روایت کا ایک حصہ منتخب کیا ہے۔ پوری روایت میں صحابہ کی قدر کے بارے میں عمومی رائے بھی بیان ہوئی ہے۔ مثلاً دیکھیے مسلم میں روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن طاؤس أنه قال :أدركت ناسا من اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقولون : كل شيء بقدر۔ قال : سمعت عبداللّٰه بن عمر رضى اللّٰه عنه يقول : قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم كل شيء بقدر حتى العجز و الكيس أو الكيس و العجز۔

''حضرت طاؤس رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کئی ایک کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہر شے کی تقدیر ہے۔ اسی طرح وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو یہ روایت کرتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر شے مقدر کر دی گئی ہے، یہاں تک کہ درماندگی اور ہوشیاری بھی۔''

اس روایت کا یہی متن کتبِ حدیث میں نقل ہوا ہے۔ طاؤس نے یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔ انھوں نے یہی الفاظ عبداللہ بن عباس سے بھی روایت کیے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معنی

یہ روایت تقدیر کے موضوع سے متعلق ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز کی تقدیر ہے یہاں تک کہ 'عجز' اور 'کیس' جیسی چیزیں بھی پہلے سے طے شدہ ہیں۔ اس روایت کا پہلا جملہ قرآنِ مجید میں بعینہٖ موجود ہے۔ سورۂ قمر میں خدا کے مجرموں کا انجام بیان ہوا ہے۔ ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہ یہ انجام جلدی کیوں سامنے نہیں آتا، فرمایا:

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ۔ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ۔ (۵۴: ۴۹-۵۰)

''ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے اور ہمارا حکم تو بس یک دفعہ پلک جھپکنے کی طرح پورا ہو گا۔''

یعنی ہر چیز ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہو رہی ہے۔ اس میں بندوں کی رعایت اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہر امر طے کیا گیا ہے۔ اس سے مجرموں کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ عذاب کی خبر محض خالی خولی دھمکی ہے۔

قدر کا لفظ ان آیات میں طے شدہ پلان کے معنی میں آیا ہے۔ ہمارے نزدیک، زیرِ بحث روایت میں بھی یہ اسی معنی میں آیا ہے۔

اس روایت کا دوسرا حصہ 'عجز' اور 'کیس' سے متعلق ہے۔ 'عجز' اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی کسی بھی وجہ سے خواہ وہ وجہ خارجی حالات سے متعلق ہو یا باطنی کیفیات سے، کوئی کام بطریقِ احسن یا بالکل نہ کر پا رہا ہو۔ اس کے متضاد مفہوم کے لیے لفظ 'کیس' استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ذکاوت کے ہیں۔ لیکن یہ نشاط، چستی اور ہشیاری کے معنی میں بھی آتا

ہے۔ہم نے 'عجز' کی مناسبت سے 'کیس' کے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔اوراس کے نتیجے میں 'عجز' کا لفظ بھی ایک خاص معنی تک محدود ہو جاتا ہے۔'عجز' سے یہاں آدمی کا کاموں کو ہشیاری سے نہ کرنا مراد ہے۔

گویا ہمارے نزدیک، روایت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز اور ہر معاملے کے لیے ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ہر انسان کو جو مزاجی خصوصیات دی گئی ہیں، وہ بھی طے شدہ ہیں۔ کچھ لوگ تیز گام اور پھرتیلے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ سست رو یا دھیمے مزاج کے ہوتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق دی گئی ہیں۔

کتابیات

موطا امام مالک، کتاب الجامع، باب ۱۲۔ مسندِ احمد، مسند عبداللہ بن عمر۔ مسلم، کتاب القدر، باب ۴۔ خلق افعال العباد، ج ۱، ص ۴۷۔ الاعتقاد، ج ۱، ص ۱۳۵۔ مسند الشہاب، ج ۱، ص ۱۴۹۔ صحیح ابنِ حبان، ج ۱۴، ص ۱۷۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانونِ جہاد

(۸)

(گزشتہ سے پیوستہ)

دوسرے مقصد کے لیے بقرہ اور انفال، دونوں میں بالترتیب '**یکون الدین للہ**' اور '**یکون الدین کلہ للہ**' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اس سے پہلے جنگ کا حکم '**قاتلوھم**' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سیاقِ کلام سے واضح ہے کہ اس میں ضمیرِ منصوب کا مرجع مشرکینِ عرب ہیں، لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ ان الفاظ کے معنی یہاں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ دین سرزمینِ عرب میں پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔ یہ مقصد دو ہی صورتوں میں حاصل ہو سکتا تھا: ایک یہ کہ دینِ حق کے سوا تمام ادیان کے ماننے والے قتل کر دیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں ہر لحاظ سے زیردست بنا کر رکھا جائے۔ چنانچہ صلح و جنگ کے بہت سے مراحل سے گزر کر جب منکرین پوری طرح مغلوب ہو گئے تو بالآخر یہ دونوں ہی طریقے اختیار کیے گئے۔ مشرکینِ عرب اگر ایمان نہ لائیں تو انھیں ختم کر دینے کا حکم دیا گیا اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ ان سے جزیہ لے کر اور انھیں پوری طرح محکوم اور زیردست بنا کر ہی اس سرزمین پر رہنے کی اجازت دی جائے۔ ان میں سے، البتہ جو معاندین تھے، انھیں جب ممکن ہوا قتل یا جلاوطن کر دیا گیا۔

ہم نے تمہید میں لکھا ہے کہ اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جو اقدامات کیے اور انھیں قتال کا جو حکم دیا گیا، اس کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمامِ حجت سے ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ اس قانون کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حجت جب کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو منکرینِ حق پر اسی دنیا میں اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ عذاب کا یہ فیصلہ رسولوں کی طرف سے انذار، انذارِ عام، اتمامِ حجت اور اس کے بعد

ہجرت و برأت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا اور رسول کے مخاطبین کے لیے ایک قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ اس کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں کم ہوتے ہیں اور اسے کوئی دار الہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اس کے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کسی سرزمین میں اس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتے ہیں۔ ان دونوں ہی صورتوں میں رسولوں سے متعلق خدا کی وہ سنت لازماً روبہ عمل ہو جاتی ہے جو قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ، اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ـ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ (المجادلہ ۵۸: ۲۰۔۲۱)

”بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک، اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔“

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد یہ ذلت اس طرح مسلط کی جاتی ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح، قومِ لوط، قومِ صالح، قومِ شعیب اور اس طرح کی بعض دوسری قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس سے مستثنیٰ صرف بنی اسرائیل رہے جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سیدنا مسیح علیہ السلام کے ان کو چھوڑنے کے بعد ان کی ہلاکت کے بجائے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا۔

دوسری صورت میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں قوم کو مزید کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اس عرصے میں دار الہجرت کے مخاطبین پر اتمامِ حجت بھی کرتا ہے۔ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر و تزکیہ کے بعد انھیں اس معرکۂ حق و باطل کے لیے تیار بھی کرتا ہے اور دار الہجرت میں اپنا اقتدار بھی اس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہلِ حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اتمامِ حجت کے بعد پہلے یہود مغلوب ہوئے۔ معاہدات کی وجہ سے انھیں تحفظ حاصل تھا، لہٰذا ان میں سے جس نے بھی نقضِ عہد کا ارتکاب کیا، اللہ کے رسول کو جھٹلانے کی یہ سزا اس پر نافذ کر دی گئی۔ بنو قینقاع کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر اور بنو نضیر کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا[۳۰]۔ پھر

۳۰؎ السیرۃ النبویہ، ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۴۰۔۴۲، ۱۵۱۔۱۶۰۔

خیبر پر حملہ کر کے وہاں بھی ان کی قوت توڑ دی گئی۔[31] اس سے پہلے انھی کے لوگوں میں سے ابورافع اور کعب بن اشرف کو ان کے گھروں میں قتل کرا دیا گیا۔[32] بنوقریظہ نے غزوۂ خندق کے موقع پر غداری کی۔[33] احزاب کے دل بادل چھٹ گئے اور باہر سے کسی حملے کا خوف باقی نہیں رہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ان کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے عاجز ہو کر انھوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہمارے حق میں جو فیصلہ کریں، وہ ہمیں منظور ہے۔ اس پر سعد بالاتفاق حکم بنائے گئے۔ قرآن میں کوئی متعین سزا چونکہ اس وقت تک ان کے لیے بیان نہیں ہوئی تھی، اس لیے سعد رضی اللہ عنہ نے تورات[34] کے مطابق فیصلہ کر دیا کہ بنوقریظہ کے بالغ مرد قتل کیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔ سعد بن معاذ کا یہ فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے تمام مرد قتل کر دیے گئے۔[35] اس کے بعد کوئی قابلِ ذکر واقعہ ان سے متعلق نہیں ہوا، یہاں تک کہ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ ان کے بارے میں نازل ہو گیا۔ ارشاد فرمایا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَايُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (۹:۲۹)

”ان اہلِ کتاب سے جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ قیامت کے دن کو مانتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ حرام ٹھیرایا ہے، اسے حرام ٹھیراتے ہیں اور نہ دینِ حق کو اپنا دین بناتے ہیں، (ان سے جنگ کرو) یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کریں۔“

یہ حکم یہود و نصاریٰ دونوں کے بارے میں تھا۔ اللہ کے آخری پیغمبر کی طرف سے اتمامِ حجت کے نتیجے میں عذابِ استیصال کا مستحق ہو جانے کے باوجود یہ ان کے لیے بڑی رعایت تھی جو ان کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ کی گئی، لیکن انھوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر غدر اور نقضِ عہد کا رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔[36] چنانچہ خیبر کے یہود اور نجران کے نصاریٰ، دونوں کو بالآخر سیدنا فاروق

۳۱؎ السیرۃ النبویۃ، ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۲۵۵۔ ۲۷۷۔

۳۲؎ السیرۃ النبویۃ، ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۴۳۔ ۴۸، ۲۱۵۔ ۲۱۷۔ الطبقات الکبریٰ، ابنِ سعد، ج ۲، ص ۲۸۔

۳۳؎ السیرۃ النبویۃ، ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۱۸۰۔ ۱۸۲۔

۳۴؎ استثنا، باب ۲۰، آیت ۱۰۔ ۱۴۔

۳۵؎ السیرۃ النبویۃ، ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۱۸۸۔ ۱۸۹۔

۳۶؎ بخاری، رقم ۳۰۲۷۔ کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۴۲۔ فتوح البلدان، البلاذری، ص ۳۷، الکامل فی التاریخ، ابن الاثیر، ج ۲، ص ۱۱۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ کے لیے جزیرہ نماے عرب سے جلاوطن کر دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی وہ بات ان کے بارے میں پوری ہوگئی جو قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَلَوْ لَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۔ (الحشر ۵۹:۳)

''اور اگر اللہ نے ان کے لیے جلاوطنی نہ لکھی ہوتی تو وہ دنیا ہی میں انھیں عذاب دے کر ان کا نام ونشان مٹا دیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب مقرر ہی ہے۔''

مشرکینِ عرب بھی جب اسی طرح مغلوب ہو گئے تو سورۂ توبہ میں اعلان کر دیا گیا کہ اب ان کے ساتھ آیندہ کوئی معاہدہ نہیں ہوگا اور ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اس کے بعد رسوائی کا عذاب ان پر مسلط ہو جائے گا جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اس دنیا میں نہ پا سکیں گے۔[۳۷] چنانچہ مکہ فتح ہوا اور جس طرح ان کے بعض معاندین بدر اور احد کے قیدیوں میں سے قتل کیے گئے تھے، اسی طرح اس موقع پر بھی قتل کر دیے گئے۔ اس سے پہلے سورۂ توبہ کا یہ حکم ان کے بارے میں نازل ہو چکا تھا کہ حجِ اکبر کے موقع پر اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ حرام مہینے گزر جانے کے بعد مسلمان ان مشرکین کو جہاں پائیں گے، قتل کر دیں گے، الا یہ کہ وہ ایمان لائیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ قرار دیے گئے جن کے ساتھ متعین مدت کے معاہدات تھے۔ ان کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ اگر وہ کوئی خلاف ورزی نہیں کرتے تو ان معاہدات کی مدت تک انھیں پورا کیا جائے گا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مدت پوری ہو جانے کے بعد یہ معاہدین بھی اسی انجام کو پہنچیں گے جو جزیرہ نماے عرب کے تمام مشرکین کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔ ایمان نہ لانے کی صورت میں یہ ان کے قتلِ عام کا اعلان تھا جو قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ ، فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ، وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ، اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا

''اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حجِ اکبر کے دن لوگوں میں منادی کر دی جائے کہ اللہ ان مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔ اس لیے اگر توبہ کر لو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر روگردانی کرو گے تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور ان منکروں کو، (اے پیغمبر)، ایک دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ مشرکین ہیں جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا اور انھوں نے اس میں نہ کوئی خیانت کی ہے اور نہ تمھارے خلاف کسی کی

---

۳۷ ۹:۱۔۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ، فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (التوبہ ۹: ۴-۵)

مدد کی ہے۔ سو ان کا معاہدہ ان کی قرار داد مدت تک پورا کرو۔ اللہ، یقیناً ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو حدود کی پابندی کرتے ہیں۔ پھر جب (حج کے بعد) حرام مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو، انھیں پکڑو، انھیں گھیرو اور ہر گھات میں ان کی تاک لگاؤ۔ ہاں، اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو، بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، وہ سراسر رحمت ہے۔‘‘

ان اقدامات سے جنگ کا وہ مقصد تو بالکل آخری درجے میں پورا ہو گیا جو ’**يكون الدين كله لله**‘ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے، لیکن اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمامِ حجت کی رو سے یہ تمام اقدامات درحقیقت اس ’’شہادت‘‘ کا لازمی نتیجہ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر قائم ہوئی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ جس طرح آپ کے ذریعے سے ان پر قائم ہوئی، اسی طرح آپ کے صحابہ جب آپ کی اس شہادت کے پس منظر میں اور ’’خیرِ امت‘‘[۳۸] بن کر اٹھے تو ان کے ذریعے سے جزیرہ نماے عرب سے باہر کی اقوام پر بھی قائم ہو گئی۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ صحابۂ کرام کو اللہ تعالیٰ نے اس شہادت کے لیے اسی طرح منتخب کیا، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ، هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۔ (الحج ۲۲: ۷۸)

’’اسی نے تم کو منتخب کیا اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، تمھارے باپ ابراہیم کی ملت تمھارے لیے پسند فرمائی۔ اس نے تمھارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے، اور اس (قرآن) میں بھی تمھارا نام مسلم ہے؛ اس لیے (منتخب کیا) کہ رسول تم پر دینِ حق کی شہادت دے اور دنیا کے باقی انسانوں پر تم اس دین کی شہادت دینے والے بنو۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۳۸ آلِ عمران ۳: ۱۱۰۔

صلح حدیبیہ کے بعد ان اقوام کا تعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سربراہوں کو خط لکھ کر کر دیا تھا۔ یہ خطوط مختلف اقوام کے آٹھ سربراہوں کو لکھے گئے۔[39] چنانچہ جزیرہ نما میں اپنی حکومت مستحکم کر لینے کے بعد صحابہء کرام ان اقوام پر بھی اس اعلان کے ساتھ حملہ آور ہو گئے کہ اسلام قبول کرو یا زیردست بن کر جزیہ ادا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کے سوا اب زندہ رہنے کی کوئی صورت تمھارے لیے باقی نہیں رہی۔ ان میں سے کوئی قوم بھی اصلاً دینِ شرک کی علمبردار نہ تھی، ورنہ وہ اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرتے جو مشرکینِ عرب کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ محض قتال نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمامِ حجت کے بعد سنتِ الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلہء خداوندی کی حیثیت سے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اس کے بعد عرب سے باہر کی اقوام پر نازل کیا گیا۔ یہ، لاریب انھی کا حق تھا جن کے ذریعے سے اللہ کی حجت ان اقوام پر قائم ہوئی اور جنھیں خود اللہ اور اس کے رسول نے 'شہداء اللہ فی الارض' قرار دیا۔ لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرینِ حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے، اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے۔ اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔

(باقی)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

[39] ان سربراہوں کے نام یہ ہیں: ۱۔ نجاشی شاہِ حبش، ۲۔ مقوقس شاہِ مصر، ۳۔ خسرو پرویز شاہِ فارس، ۴۔ قیصر شاہِ روم، ۵۔ منذر بن ساوی حاکمِ بحرین، ۶۔ ہوذہ بن علی صاحبِ یمامہ، ۷۔ حارث بن ابی شمر حاکمِ دمشق، ۸۔ جیفر شاہِ عمان۔

جاوید احمد غامدی/منظور الحسن

اجتہاد

[مدیرِ ''اشراق'' کے افادات سے مرتب کیا گیا]

قرآن وسنت کے ذریعے سے ہمیں جو دین ملا ہے اس کے دو اجزا ہیں۔ ایک الحکمۃ اور دوسرے الشریعۃ۔

''الحکمۃ''، ایمانیات اور اخلاقیات کے مباحث پر مبنی ہے۔ توحید، رسالت، آخرت اور اس نوعیت کے دوسرے موضوعات ایمانیات کے ذیل میں اور عدل، رحم، احسان، حیا اور ان جیسے فطرتِ انسانی کے مسلمہ حقائق اخلاقیات کے ضمن میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں، ہم ان مباحث کو فلسفہ وحکمت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

''الشریعۃ'' سے مراد مراسمِ عبودیت اور معاملاتِ زندگی سے متعلق وہ قواعد وضوابط ہیں جنھیں انسان اپنی عقل وفطرت کی بعض محدودیتوں کی وجہ سے بہ تمام وکمال دریافت نہیں کر سکتا۔ شریعت کے یہ قواعد وضوابط بہت وضاحت کے ساتھ قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کے تحت بندگیِ رب کے طریقے اور معاشرت، معیشت، سیاست، دعوت، جہاد، حدود وتعزیرات اور خورونوش جیسے معاملاتِ زندگی کے بارے میں اصول وضوابط اور حدود وقیود بیان کیے جاتے ہیں۔ انھی کی بجا آوری پر انسان کی اخروی فوز وفلاح کا انحصار ہے۔

شریعت کے بارے قرآنِ مجید کے مطالعے سے حسبِ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ شریعت سرتاسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے اور ان امور کے بارے میں انسان کی رہنمائی کرتی ہے جن سے انسان ناواقف ہو یا اس کی عقل صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر ہو۔

وَاَنۡـزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ وَكَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡماً۔ (النساء ۴: ۱۱۳)

''اللہ نے تم پر ''الکتاب''[۱] اور ''الحکمۃ'' نازل فرمائی اور اس طرح تمھیں وہ چیز سکھائی جس سے تم واقف نہ تھے، اور اللہ کی تم پر بڑی عنایت ہے۔''

---

[۱] قرآنِ مجید میں ''الشریعۃ'' کے لیے ''الکتاب'' کی اصطلاح بھی اختیار کی گئی ہے۔

۲۔شریعت واضح اور متعین ہے۔اس کی پیروی لازم ہے۔اس کے مقابل میں کسی اور چیز کی پیروی ممنوع ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَاتَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الجاثیہ۴۵:۱۸)

''پھر ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک واضح شریعت پر قائم کیا ہے۔اس لیے تم اسی کی پیروی کرو اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلو جو علم نہیں رکھتے۔''

۳۔اسلام سے پہلے انسانی تمدن میں ارتقا اور تغیر کے باعث اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لیے الگ الگ شریعت مقرر کی تھی۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَا جًا وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (المائدہ۵:۴۸)

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شرع اور منہاج مقرر کیا ہے، اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔''

۴۔دین کی تکمیل کے ساتھ ہی شریعت بھی مکمل ہوگئی۔چنانچہ اب رہتی دنیا تک اسلامی شریعت ہی قطعی اور حتمی شریعت ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدہ۵:۳)

''اب میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔''

۵۔اسلامی شریعت کے سوا کسی اور شریعت کو اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت حاصل نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (آلِ عمران۳:۸۵)

''اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔''

۶۔اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد کسی شخص کے لیے اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ وہ شریعت سے انحراف یا اس میں تغیر و تبدل کر سکے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب۳۳:۳۶)

''کسی مومن یا مومنہ کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۷۔ شریعت نہایت مختصر ہے۔

۸۔ بیشتر معاملات میں شریعت اصول وضع کرتی ہے اور جزئی تفصیلات کو بیان نہیں کرتی۔

اس شریعت کو جب ہم اپنے انفرادی یا اجتماعی وجود پر قانون کی صورت میں نافذ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس موقع پر دو طرح کے امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ایک وہ امور جن میں شریعت کی طرف سے قانون سازی موجود ہے اور دوسرے وہ امور جن میں شریعت خاموش ہے۔ پہلی نوعیت کے امور میں ہم شریعت پر غور و تدبر کر کے اس کے مدعا اور منشا کو متعین کرتے ہیں۔ دوسری نوعیت کے امور میں ہم شریعت کے منشا تک پہنچنے کے لیے ''اجتہاد'' کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

اجتہاد کا مفہوم

اجتہاد کا لغوی مفہوم کسی کام کو پوری سعی و جہد کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ جس معاملے میں قرآن و سنت خاموش ہیں، اس میں نہایت غور و خوض کر کے دین کے منشا کو پانے کی جدوجہد کی جائے۔ یہ اصطلاح جس ماخذ سے وجود پزیر ہوئی ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک روایت ہے۔ یہ روایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیدنا معاذ بن جبل کے ساتھ ایک گفتگو پر مبنی ہے:

عن معاذ انه قال لما بعثنی رسول الله صلى الله عليه وسلم الى اليمن، قال : كيف تقضى اذا عرض لك قضاء، قال: اقضى بكتاب الله۔ قال: فان لم يكن فى كتاب الله، قال: فبسنة رسول الله ، قال : فان لم يكن فى سنتة رسول الله، قال، اجتهدوا راى ولا آلو، قال، فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدره و قال: الحمد لله الذى وفق رسول رسول الله لما يرضى به

''سیدنا معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا کہ: ''جب تمھارے سامنے کوئی معاملہ فیصلہ کے لیے آئے گا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟'' میں نے جواب دیا: ''میں اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب کی روشنی میں کروں گا۔'' فرمایا: ''اگر اللہ کی کتاب میں اس کے متعلق کوئی واضح بات نہ ملے تو کیا کرو گے؟'' میں نے عرض کیا: ''پھر رسول اللہ کی سنت کے مطابق کروں گا۔'' پھر فرمایا: ''اگر رسول اللہ کی سنت میں بھی اس کے متعلق کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں کیا کرو گے؟'' میں نے عرض کیا: ''تو پھر میں اجتہاد کروں گا اور اس اجتہاد میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔'' رسول اللہ صلی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رسول اللہ۔ (ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)

اللہ علیہ وسلم نے میری بات سن کر میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''اس اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔''

اس روایت کے الفاظ 'اجتهدو رائی' سے ''اجتہاد'' کا لفظ ہمارے ہاں فقہ و قانون میں بطورِ اصطلاح استعمال ہونے لگا ہے۔

اس اصطلاح کو اگر مذکورہ روایت کی روشنی میں سمجھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد سے مراد اپنی عقل و بصیرت سے ان امور کے بارے میں رائے قائم کرنا ہے جن میں قرآن و سنت خاموش ہیں یا انھوں نے کوئی متعین ضابطہ بیان نہیں کیا۔

یہاں یہ واضح رہے کہ مذکورہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ اس کے مضمون سے، البتہ یہ تاثر ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی کوئی بات ضرور ارشاد فرمائی ہوگی۔ مزید برآں حضرت عمر اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے منسوب حسبِ ذیل روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کے نام فرمان جاری کیا:

اذا وجدت شیئاً فی کتاب اللہ فاقض به ولا تلتفت الی غیرہ واذا اتی شیء لیس فی کتاب اللہ و لیس فی سنة رسول اللہ ولم یقل فیه احداً قبلك فان شئت ان تجتهد رایك فتقدم وان شئت ان تتاخر فتاخر وما اری التاخر الا خیرا لك۔

(النسائی، کتاب آداب القضاۃ)

''جب تمھیں اللہ کی کتاب میں کوئی بات مل جائے تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اس کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ مت کرو اور جب کوئی ایسا معاملہ پیش آ جائے جس کے متعلق نہ اللہ کی کتاب میں ہو، نہ رسول اللہ کی سنت میں کچھ ہو اور نہ تم سے پہلے کسی اور ہی نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہو تو تم اس معاملے میں اجتہاد کرنا چاہو تو اجتہاد کرو اور اگر توقف کرنا چاہو تو توقف کرو اور میں توقف کو تمھارے لیے بہتر خیال کرتا ہوں۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

فمن عرض له منکم قضاء بعد الیوم فلیقض بما فی کتاب اللہ فان جاء امر لیس فی کتاب اللہ فلیقض بما

''پس اب تم میں سے جس کے سامنے کوئی معاملہ فیصلے کے لیے پیش ہو تو اسے چاہیے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور اگر ایسا کوئی معاملہ آ جائے

قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فلیقض بما قضی بہ الصالحون فان جاء امر لیس فی کتاب اللہ ولا قضی بہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا قضی بہ الصالحون فلیجتہد رایہ ولا یقول انی اخاف انی اخاف۔ (النسائی، کتاب آداب القضاۃ)

جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہوتو اس کا فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق کرے۔ اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو صالحین نے اس کا جو فیصلہ کیا ہو اس کی پیروی کرے۔ لیکن اگر ایک معاملہ ایسا آ جائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں اور نہ صالحین نے اس سے پہلے کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو تو اپنی رائے سے (حق وصواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کرے اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں، میں ڈرتا ہوں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اجتہاد کا طریقِ کار

اگر کسی معاملے میں شریعت نے قانون سازی نہیں کی تو اس معاملے میں اجتہاد کے لیے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس سے ملتے جلتے کسی دوسرے معاملے میں کوئی قانون موجود ہے۔ اگر کوئی قانون موجود ہے تو اس پر قیاس کر کے قانون وضع کر لیا جائے گا۔ اگر کسی مشابہ معاملے میں قانون موجود نہیں ہے تو پھر یہ معلوم کیا جائے گا کہ شریعت میں کیا کوئی ایسا اصول موجود ہے جس سے اس معاملے کے ضمن میں رہنمائی مل سکے۔ اگر کوئی اصولی ہدایت موجود ہے تو اس سے استنباط کر کے قانون بنا لیا جائے گا۔ اگر کوئی مشابہ معاملہ بھی موجود نہ ہو اور نہ اصولی ہدایت میسر ہو تو اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کر کے اس کے مطابق قانون سازی کر لی جائے گی، مگر اس موقع پر اس بات کا ہر حال میں لحاظ رکھا جائے گا کہ کوئی بات شریعت کے منشا کے خلاف یا اس کے حدود سے متجاوز نہ ہو۔

اجتہاد کا دائرۂ کار

مندرجہ بالا روایت کی روشنی میں اجتہاد کے دائرۂ کار کو حسبِ ذیل نکات کی صورت میں متعین کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اجتہاد کا تعلق انھی معاملات سے ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے دین و شریعت سے متعلق ہیں۔

۲۔ انسانوں کو انفرادی یا اجتماعی حوالے سے جب بھی قانون سازی کی ضرورت پیش آئے تو انھیں چاہیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن و سنت سے رجوع کریں۔

۳۔ جن معاملات میں قرآن و سنت کی رہنمائی موجود ہے، ان میں قرآن و سنت کی پیروی لازم ہے۔

۴۔ جن معاملات میں قرآن و سنت خاموش ہیں، ان میں انسانوں کو چاہیے کہ اپنی عقل و بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے

آرا قائم کریں۔

ان نکات کی بنا پر یہ بات بطورِ اصول بیان کی جا سکتی ہے کہ شریعت محلِ اجتہاد نہیں ہے، بلکہ محلِ اتباع ہے۔ محلِ اجتہاد صرف وہی امور ہیں جن کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ چنانچہ اجتہادی قانون سازی کرتے ہوئے، مثال کے طور پر عبادات کے باب میں، یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ تمدن کی تبدیلی کی وجہ سے اب نمازِ فجر طلوعِ آفتاب کے بعد پڑھی جائے گی؛ معیشت کے دائرے میں یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ اب زکوٰۃ ڈھائی فی صد سے زیادہ ہوگی؛ سزاؤں کے ضمن میں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ قتل کے بدلے میں قتل کے بجائے عمر قید کی سزا دی جائے گی۔ گویا شریعت کے دائرے میں علما اور محققین کا کام صرف اور صرف یہی ہے کہ احکام کے مفہوم و مدعا کو اپنے علم و استدلال کے ذریعے سے متعین کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ان کے لیے کسی تغیر و تبدل کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ البتہ، جس دائرے میں شریعت خاموش ہے، اس میں وہ دین و مذہب، تہذیب و تمدن اور عرف و رواج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر طرح کی قانون سازی کر سکتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اجتہاد کی اقسام

ہمارے فقہا نے اجتہاد کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ ان میں سے دو اقسام نمایاں ہیں۔ ایک اجتہادِ مطلق ہے اور دوسری اجتہادِ مقید ہے۔ اجتہادِ مطلق سے ان کی مراد وہ امور ہیں جو بالکل نئے ہوں اور جن کے بارے میں اجتہاد کی مثال تاریخ میں موجود نہ ہو۔ اجتہادِ مقید ان مسائل سے متعلق ہوتا ہے جو ماضی میں بھی پیش آئے ہوں اور جن پر اجتہادی کام کے نظائر بھی تاریخ میں موجود ہوں۔

ہمارے نزدیک، اجتہادی کام کی اس طرح کی تقسیم تفہیمِ مدعا کے لیے تو مفید ہو سکتی ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے اجتہاد کی ایک ہی نوعیت ہے اور وہ ان معاملات میں رائے قائم کرنا ہے جن میں شریعت نے کوئی رہنمائی نہ کی ہو۔

اجتہاد کی شرائط

ہمارے روایتی علمِ فقہ میں مجتہد کے لیے کچھ ناگزیر شرائط کا تعین کیا جاتا ہے۔ ان میں سے نمایاں شرائط یہ ہیں:

۱۔ مجتہد ماخذِ دین کی زبان یعنی عربی سے کما حقہ واقف ہو۔

۲۔ قرآنِ مجید کا جید عالم ہو۔

۳۔ سنت، حدیث اور عملِ صحابہ سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔

۴۔ ماضی کے اجتہادی اور فقہی کام پر گہری نظر رکھتا ہو۔

۵۔ صاحبِ تقویٰ ہو۔

یہ سب شرائط قابلِ لحاظ ہیں اور ان میں زمانے کی ضروریات کے پیشِ نظر بعض اضافے بھی کیے جا سکتے ہیں، مگر ہمارے

نزدیک اجتہاد کے معاملے میں اس نوعیت کی شرائط کو لازم ٹھہرانا اور ان کے بغیر کسی اجتہاد کو نا قابلِ قبول قرار دینا، حسبِ ذیل پہلووں سے نامناسب ہے:

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کی ہدایت فرماتے ہوئے یا کسی دوسرے موقع پر، اس نوعیت کی شرائط کو متعین نہیں فرمایا۔ چنانچہ دین کے جس معاملے میں آپ نے تحدید نہیں فرمائی، اس میں بغیر کسی ضرورت کے ہمیں کوئی حد بندی نہیں کرنی چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرائط کی بحث بالکل بے معنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی اجتہادی رائے کی صحت یا عدمِ صحت کا فیصلہ علم و تقویٰ کی بنیاد پر نہیں، بلکہ دلیل و استدلال کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ دلیل اگر قوی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بعض مفروضہ شرائط کے پورا نہ ہونے کی بنا پر کسی اجتہاد کو رد کر دیا جائے اور اگر دلیل کمزور ہے تو اجتہاد خواہ کیسی ہی جامع الشرائط شخصیت نے کیا ہو، اسے بہر حال نا قابلِ قبول قرار پانا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ یہ عین ممکن ہے کہ کسی معاملے میں متعلقہ شعبے کے ماہر کی رائے مذکورہ شرائط پر پورا اترنے والے کی رائے سے زیادہ وقیع ہو۔ مثال کے طور پر یہ ہوسکتا ہے کہ طب کے کسی معاملے میں ایک ڈاکٹر کا اجتہاد عربی زبان و ادب کے کسی فاضل کے اجتہاد کے مقابلے میں زیادہ قرینِ حقیقت ہو۔ اسی طرح شریعت میں سود کی تعریف متعین ہو جانے کے بعد اس کے اطلاق کے معاملے میں کسی ماہرِ معیشت کی رائے کسی عالمِ دین کی رائے سے زیادہ صائب ہو سکتی ہے۔

اس بنا پر یہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے کسی طرح کی کوئی قدغن نہیں ہے۔ یہ دروازہ ہر مسلمان کے لیے اس کی انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں پوری طرح کھلا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اجتہاد کا نفاذ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی اجتہادی رائے کے رد و قبول یا مختلف اجتہادی آرا میں سے ترجیح و اختیار کا فیصلہ کون کرے گا؟

اجتہاد کے رد و قبول یا ترجیح و اختیار کی ضرورت دو موقعوں پر پیش آتی ہے: ایک اس موقع پر جب افراد کو ذاتی معاملات میں کوئی رائے قائم کرنا ہوتی ہے اور دوسرے اس وقت جب کسی اجتماعی معاملے میں قانون سازی کی ضرورت سامنے آتی ہے۔ ذاتی معاملات میں کسی رائے کو اختیار کرنے کا فیصلہ فرد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انتقالِ خون کا تقاضا سامنے آنے پر وہ اس کے جواز اور عدمِ جواز کے حوالے سے رائے قائم کر کے، عطیہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ جہاں تک اجتماعی سطح پر کسی اجتہادی رائے کو قانون کی شکل دینے کا تعلق ہے تو اس کا اختیار، سر تا سر مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد کو حاصل ہے۔ وہ خود بھی اجتہاد کر سکتے ہیں، کسی ماہرِ فن کی رائے کو بھی قانون کی شکل دے سکتے ہیں اور کسی عالمِ دین کا نقطۂ نظر بھی قبول کر سکتے

ہیں۔ فیصلہ، بہر حال انھی کو کرنا ہے۔ان کی اکثریت جس اجتہاد کو قبول کر لے گی، وہی قانون کی حیثیت سے نافذ العمل قرار پائے گا۔ مسلمانوں میں سے کسی شخص کے لیے اس کی خلاف ورزی جائز نہ ہوگی۔ اس سے اختلاف کا حق، البتہ ہر شخص کو حاصل رہے گا۔ ممکن ہے کہ اربابِ حل وعقد کسی کی اختلافی رائے سے متاثر ہو کر، بعد ازاں قانون میں تبدیلی کا فیصلہ کر لیں۔ چنانچہ قرآن وسنت کی تعبیر کا مسئلہ ہو یا کسی ایسے معاملے میں اجتہاد کا جس میں شریعت خاموش ہے، یہ مسلمانوں کے منتخب نمائندے ہی ہیں جن کے فیصلے سے کوئی رائے اسلامی ریاست میں قانون کا درجہ حاصل کر سکتی ہے۔

ماضی کے اجتہادی کام کی حیثیت

قانون وشریعت کے دائرے میں ہمارے جلیل القدر ائمہ نے بہت وقیع کام کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فہم کے مطابق، شریعت کے مفہوم و مدعا کی تعیین، اس کی شرح و وضاحت اور مختلف معاملات پر اس کے اطلاق کا کام بھی کیا ہے اور فقہی معاملات میں اپنے حالات کے تقاضوں کے لحاظ سے اجتہادات بھی کیے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اگر کوئی شخص اجتہادی کام کرنا چاہے تو وہ ان کے کام سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ لیکن، بہر حال یہ انسانی کام ہے۔ انسانی کام، ظاہر ہے کہ غلطی کے امکان اور اختلافِ رائے سے مبرا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا، ان کی آرا سے اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تاریخ ان علمی اختلافات سے بھری پڑی ہے جو بعد میں آنے والوں نے ان کی آرا کے بارے میں کیے ہیں۔ ہمارے جید علما نے دین وشریعت کے معاملے میں بھی اور فقہ واجتہاد کے معاملے میں بھی اس علمی کام میں کوئی انقطاع نہیں آنے دیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اجتہاد کے بارے میں بعض غلط فہمیاں

اجتہادی کام کے حوالے سے ہمارے اکثر اہلِ علم و دانش بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ اس بنا پر ہمارے ہاں اس اصطلاح کے بارے میں کافی خلطِ مبحث موجود ہے۔ ان غلط فہمیوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

ایک غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ معاملاتِ زندگی سے متعلق ان امور میں بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے، جن میں شریعت کی ہدایات موجود ہیں۔ مثال کے طور تمدنی ضروریات کے پیشِ نظر، خواتین کے لیے حجاب کے حدود، جہاد، طلاق، عورت کی شہادت، دیت اور اس طرح کے بعض دوسرے امور کے حوالے سے شریعت میں تغیر وتبدل اور ترمیم واضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم تمہید میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ بات قرآن وسنت کے نصوص کے خلاف ہے۔ جن امور میں شریعت کی کوئی تصریح موجود ہے، ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ زبان و بیان کے کسی علمی اختلاف کی بنا پر یہ امور محلِ تحقیق تو ہو سکتے ہیں، محلِ اجتہاد ہرگز نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ان میں قرآن وسنت کے صحیح منشا تک پہنچنے کے لیے نئی تحقیق پیش کی جا سکتی ہے اور قدما کی تحقیقات کو دلائل کی بنیاد پر غلط بھی قرار دیا جا سکتا ہے، مگر اس دائرے میں اجتہاد کا دروازہ ہرگز نہیں کھولا جا سکتا۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ امت میں اجتہاد کا دروازہ گزشتہ کئی صدیوں سے بند ہے۔

یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں شاید ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جب اجتہاد کا دروازہ بند ہوا ہو۔ یہ عمل پیغمبر اور صحابہ کے زمانے میں بھی جاری تھا، بعد کے ادوار میں بھی پورے تسلسل سے قائم رہا اور آج بھی بغیر کسی انقطاع کے جاری ہے۔ اجتہاد اس وقت بھی ہوتا رہا جب اقوامِ عالم کی قیادت و سیادت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اور اس وقت بھی ہو رہا ہے جب وہ محکومی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اجتہاد کے بارے میں یہ تصور ہمارے علما کے تقلیدِ جامد پر اصرار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ فقہ شریعت ہی کا ایک حصہ ہے۔

فقہ، درحقیقت وہ قانون سازی ہے جو ہمارے فقہا نے شریعت کی روشنی میں کی ہے۔ یہ الہامی نہیں، بلکہ انسانی کام ہے۔ یہ قوانین ہمارے فقہا نے اپنے فہمِ دین کے مطابق، اپنے تمدن کے تقاضوں کے پیشِ نظر اور اپنے سیاسی و معاشرتی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وضع کیے ہیں۔ یہ ہمارے لیے واجب الاطاعت نہیں ہیں۔ ہم ان کی آرا سے اختلاف کر سکتے ہیں اور شریعت کی روشنی میں اپنے حالات کے لحاظ سے، جب چاہیں نئی فقہ مرتب کر سکتے ہیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

احسان الرحمٰن غوری

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار

(Dead Sea Scrolls)

بیسویں صدی کے وسط میں دریافت ہونے والی چند دستاویزات نے دنیا کے علمی حلقوں میں بائبل سے متعلق تحقیق کی ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ یہ دستاویزات وادئ قُمران کے بعض غاروں سے دستیاب ہوئیں۔ چونکہ وادئ قمران بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے کنارے واقع ہے اس لیے ان دستاویزات کو ہمارے ہاں ''دستاویزاتِ بحیرۂ مردار'' کہا جاتا ہے۔ ان غاروں میں یہ دستاویزات طوامیر[1] کی شکل میں مٹی کے بنے ہوئے مرتبانوں میں محفوظ کی گئی تھیں۔ اس لیے علمی حلقوں میں ان دستاویزات کو ''طوامیرِ بحیرۂ مردار (Dead Sea Scolls=DSS)'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

علمی حلقوں خصوصاً بائبل کے عہد نامۂ قدیم کے محققین کو اس دریافت نے بہت سے نئے پہلوؤں سے روشناس کرایا چونکہ ان کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کے عہد سے بھی تھا اس لیے یہ طوامیر عہد نامہ جدید کے محققین کی خصوصی توجہ کا مرکز بھی بنے۔ ذیل میں وادئ قمران کے غاروں سے دریافت شدہ ان طوامیر پر مختلف پہلوؤں سے مختصر مگر جامع گفتگو کی جائے گی۔

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار کا تعارف:

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار ۱۹۴۷ء سے لے کر ۷۰ء کے عشرے کے نصف اول تک کے دوران میں اُردن اور

---

[1] طوامیر: طومار کی جمع۔ انگریزی میں سکرول (Scroll) کہتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں جب کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا، تو لکھنے کے لیے مختلف قسم کی اشیا استعمال کی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک پیپرس (Papyruus) ہے۔ دریائے نیل کے دہانے کے علاقے میں ایک قسم کے سرکنڈے پیدا ہوتے تھے۔ ان کے پتوں کو پہلے عرضاً بچھا جاتا۔ پھر ان پر طولاً دوسری تہ لگا دی جاتی۔ ان کے درمیان کوئی چپکنے والی چیز رکھی جاتی اور انھیں کوٹ کر اور کناروں کو مناسب انداز میں کاٹ کر تھیسس پیپر کے سائز کا ایک کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ پھر ان کاغذوں کو جوڑ کر یا سی کر قریباً تیس فٹ لمبی پٹی سی بنالی جاتی تھی۔ اس کے دونوں سروں کو گول لکڑی (Roller) سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر اسے لپیٹ کر اس کا ایک بیلن سا بنا جاتا تھا۔ اسے طومار یا سکرول (Scroll) کہا جاتا ہے۔

اسرائیل کے صحرائی علاقے میں موجود غاروں سے برآمد ہوئیں جو بحیرۂ مردار کے ساحل کے قریب واقع ہیں۔ان دستاویزات کا زیادہ تر حصہ وادئ قُمران (Wadi Qumran) سے برآمد ہوا جو بحیرۂ مردار کے شمال مغربی ساحلی حصے میں واقع ہے۔چند مزید دستاویزات جیسے طوامیر مسادا (Massada Scrolls) اوروادئ مربعات سے دریافت شدہ دستاویزات کو بھی دستاویزاتِ بحیرۂ مردار ہی میں شامل سمجھا جاتا ہے۔دراصل یہ تمام دستاویزات یہودیوں کے ایک فرقے کی لائبریری کا حصہ تھے۔یہ فرقہ جسے اسینی (Essenes) کہا جاتا تھا،حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً تین صدیاں قبل وجود میں آیا۔اس دوران میں بنی اسرائیل پر یکے بعد دیگرے یونانیوں اور رومیوں کی حکومت رہی۔[2]

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار ہی کے سلسلے کی ایک کڑی وہ دستاویزات ہیں جو ۱۸۹۶ء میں ان کی دریافت کے آغاز سے قریباً نصف صدی قبل قاہرہ کے قریب فسطاط کی ایک یہودی عبادت گاہ(Ezra Synagogue)[3] سے دریافت ہوئی تھیں۔ ان دستاویزات کو دستاویزاتِ دمشق (Damascus Documents)، صدوقی دستاویزات (Zadokite Documents) اوردستاویزاتِ جنیزۂ قاہرہ(Cairo Genezah)[4] بھی کہا جاتا ہے۔[5] ان میں یہودیوں کے ایک فرقے سے متعلق معلومات اوران کے عقائد کا ذکر موجود تھا۔دستاویزاتِ بحیرۂ مردار کی دریافت کے بعد پتا چلا کہ مذکورہ تحریروں میں جس یہودی فرقے کا ذکر ہے وہ یہی اسینی ہیں۔[6] انسائیکلو پیڈیا امریکانا میں ان دستاویزات کا تعارف بڑے جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس میں درج ہے کہ ان دستاویزات میں عہد نامۂ قدیم (توراۃ وغیرہ) کی قدیم ترین نقول دستیاب ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ متعدد غیر از بائبل کتب مثلاً کتابِ انوخ، کتابجوبلی وغیرہ کے گم شدہ اصل نسخے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔بحیرۂ مردار کے ان غاروں سے اسینی فرقے کی ذاتی تحریریں بھی حاصل ہوئی ہیں۔ان تحریروں کے مطالعے سے مسیحیت کے آغاز اور حضرت یحییٰؑ اور حضرت مسیحؑ کی

---

۲ *Encyclopedia of Religion,* McMillan Pub. Co. N.Y., (1986), Vol-4, p. 249.

۳ *The Standard Jewish Encyclopedia,* Ed. by Cecil Roth, W.H.Allen, London, (1959), p. 386.

۴ جنیزہ(Genezah) ایسا محفوظ مقام ہے جہاں پر بوسیدہ مقدس کتب کو محفوظ کیا جاتا تھا۔یہودی علما ایسے مقدس دھاتی ظروف اور تحریروں کو، جو استعمال کے قابل نہیں رہتے تھے، ضائع کرنے کے بجائے کسی خفیہ جگہ پر چھپا دیتے تھے۔عموماً یہودی عبادت گاہ سے متصل کسی خفیہ کمرے، تہ خانے یا کسی غار میں ان مقدس چیزوں کو چھپایا جاتا تھا۔اس خفیہ مقام کو جنیزہ کہتے ہیں۔(دی سٹینڈرڈ جیوئش انسائیکلو پیڈیا،ص۔۷۳۶)۔

۵ *The Standard Jewish Encyclopedia,* p. 1952.

۶ *Encyclopedia of Religion*, Vol-4, p.249.

دعوت سے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔مزید برآں ان دستاویزات کی اہمیت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے عہد نامۂ قدیم کے ہفتادی یونانی ترجمے کی نقول بھی دستیاب ہوئی ہیں، جو عہد نامۂ قدیم کے متن کی ابتدائی تاریخ مرتب کرنے میں بہت معاون ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دستاویزات بائبل کی تاریخ میں ایک عظیم دریافت ہیں۔اصل اقتباس درج ذیل ہے:

> The Dead Sea Scrolls include the oldest known copies of the Old Testament scriptures as well as the long-lost originals of several books of the Apocrypha and of such celebrated pseudepigraphic, or non-Biblical, Jewish religious works as the books of Enoch, Jubilees, and the Testaments of the Twelve Patriarchs. There are also a number of sectarian writings that throw light on the religious climate of the Holy Land during the nascent years of Christianity and that provide a backdrop to the missions of John the Baptist and Jesus. In addition, there are early copies of the Septuagint (Greek) version of the Old Testament, which help to reconstruct the textual history of that earliest of Bible translations. The Dead Sea Scrolls have been acclaimed as "the greatest manuscript discovey ever made in the field of biblical studies." [stress added][۷]

انٹرپریٹرز ڈکشنری آف دی بائبل نے ان دستاویزات سے متعلق تعارفی کلمات میں انھیں بائبل کی تاریخ، یہودی مذہب اور مسیحیت کی ابتدا کے حوالے سے بہت اہم دریافت قرار دیا ہے۔مقالے کا مصنف لکھتا ہے:

> [DSS are] The writings of an Essene community which were discovered in 1947 near the Dead Sea. These scrolls and the fragments found with them represent the most important find of MSS bearing on the Bible, the Jewish religion, and the biginnings of Christianity. [۸]

انسائیکلو پیڈیا جوڈیکا دستاویزاتِ بحیرہ مردار کے تعارف میں بیان کرتا ہے کہ ان دستاویزات میں وہ تمام

---

۷ ***The Encyclopedia Americana,*** Grolier Incorporated, Connecticut. (1984), Vol-3, p.553.

۸ ***The Interpreter's Dictionary of the Bible***, (Under Entry:Dead Sea Scrolls" by O.Betz), Abingdon Press,

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسودے شامل ہیں جو قمران اور اس کے گردونواح (مثلاً مربعات، خربۃ میرد، عین جدی اور مسادا وغیرہ) سے حاصل ہوئے۔

The popular designation given to collections of manuscript material found in 1947 and the following years in various areas west of the Dead Sea, notably Qumran, Murabbaat, Khirbat Mird, together with En-Gedi, Masada. This entry concentrates on those found in the Qumran region (by far a greatest in bulk and probably in importance); those found at En-Gedi, Masada, and Murabbaat are treated under these respectively.[۹]

یہ دستاویزات زیادہ تر بائبل کے عہد نامہ قدیم کے متن پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دستاویزات میں اس فرقے کے اپنے عقائد بھی درج ہیں۔

دستاویزاتِ بحیرۂ مردار اور ان سے متعلقہ آثارِ قدیمہ کی دریافت

ا۔ دستاویزاتِ بحیرۂ مردار کی دریافت

ان دستاویزات کی دریافت[۱۰] ایک اتفاقی واقعہ کا نتیجہ ہے۔ فروری یا مارچ ۱۹۴۷ء میں تعمیریہ قبیلے کا ایک پندرہ سالہ نوجوان محمد الذئب اور اس کا ایک ساتھی بکریاں چراتے ہوئے بحیرۂ مردار کے مغربی کنارے تک پہنچ گئے۔ یہاں ان کی ایک بکری گم ہوگئی۔ ان میں سے ایک لڑکا اس بکری کی تلاش میں ایک غار کے دہانے تک پہنچ گیا۔ اس لڑکے نے بکری کی موجودگی کا اندازہ لگانے کے لیے غار میں ایک پتھر پھینکا۔ اتفاق سے یہ پتھر مٹی کے ایک برتن سے جا ٹکرایا۔ لڑکا اس غیر مانوس آواز پر چونکا اور اپنے ساتھی لڑکے کو بلا لایا۔ دونوں رینگتے ہوئے غار کے اندر جا پہنچے اور یہاں انھیں مٹی کے آٹھ برتن ملے۔ انھوں نے ایک برتن کھولا تو اس میں سے چرمی کاغذ نکلے۔ جنھیں باہم سی کر

N.Y.(1962), Vol-1, p. 790.

۹ ***Encyclopaedia Judaica***, (Under Entry, dead-sea-scrolls), CD-Rom Edition, Judaica Multimedia(Israel) Ltd.(1997), Ver-1.0, p.1.

۱۰ DSS کی دریافت اور اس کے بعد کے واقعات مندرجہ ذیل کتب سے اخذ کیے گئے ہیں:

Dr. Miller Burrows, ***Dead Sea Scrolls***, The Viking Press, N.Y., (1956), pp.3-69.

F.F.Bruce, ***Second Thoughts on the Dead Sea Scrolls***, WM.B.Eerdmans Pub.Co., Michigan, (1956),pp.15-33.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

طوماروں کی صورت میں سوتی کپڑے میں لپیٹ دیا گیا تھا۔انھوں نے یہ تمام چیزیں کئی ہفتے تک اپنے پاس رکھیں۔ بالآخر یہ لڑکے ان طوامیر کے ساتھ بیت اللحم پہنچ گئے۔

یہ دستاویزات اتفاقی دریافت کے بعد بھی کافی مدت تک اربابِ علم وتحقیق سے مخفی رہیں اور اہلِ علم کے ہاتھوں تک پہنچنے کے لیے انھیں بڑے طویل اور دلچسپ مراحل سے گزرنا پڑا۔ محمد الذئب اور اس کے دوستوں نے یہ دستاویزات بیت اللحم کے ایک مسلمان شیخ کو دکھائیں۔لیکن وہ ان دستاویزات کی زبان سے واقف نہ تھا۔اس کے خیال میں یہ سُریانی (Syriac) زبان میں لکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس نے یہ دستاویزات بیت اللحم کی سریانی آرتھوڈوکس کمیونٹی (Syriac Orthodox Community) کے ایک رکن خلیل اسکندر کے پاس بھجوا دیں۔ خلیل اسکندر ان دستاویزات کی تحریر سے ناواقفیت کی بنا پر یروشلم چرچ کے ایک رکن جارج یسیعاہ (George Isaiah) کے پاس لے گیا۔اس نے بھی ان دستاویزات سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ دونوں ان دستاویزات کو چرچ کے آرچ بشپ سیموئیل (A.Y.Samuel) کے پاس لے گئے۔ آرچ بشپ سیموئیل ان دستاویزات کو دیکھنے والے وہ پہلے عالم تھے جو اِن طوامیر کی قدر و قیمت کسی حد تک پہچان سکے۔انھوں نے اس کے چند ٹکڑوں کا بغور جائزہ لے کر بتایا کہ یہ چمڑے کے طومار ہیں۔ آرچ بشپ نے یہ دستاویزات خرید لیں۔اس واقعے کے کئی ہفتے بعد ایک مرتبہ پھر خلیل اسکندر اور جارج یسیعاہ آرچ بشپ سے ملنے آئے۔ وہ اپنے ساتھ تین بدوؤں کو لائے تھے، جن کے پاس چند مزید دریافت شدہ طوامیر تھے۔لیکن انھیں چرچ میں آنے کی اجازت نہ مل سکی۔ ان میں سے دو بدوؤں نے اپنے طوامیر جارج یسیعاہ کے پاس رکھوا دیے اور تیسرا انھیں اپنے ساتھ لے گیا۔ غالباً یہی وہ طوامیر ہیں جنھیں نومبر میں پروفیسر سکینک (Prof. Sukenik) نے حاصل کیا تھا۔ دو ہفتوں کے بعد دونوں بدو جارج یسعیاہ کے پاس آئے اور وہاں سے وہ سینٹ مارک کی خانقاہ (St. Mark Monastry) پہنچے۔اس مرتبہ وہ آرچ بشپ کے ساتھ ملاقات میں کامیاب ہوگئے۔ آرچ بشپ نے ان بدوؤں کے ملکیتی پانچوں طوامیر خرید لیے۔

اس دوران پروفیسر سکینک کو ایک تاجر نے چند طوامیر اور کچھ مرتبان بھی دکھائے جو سکینک نے خرید لیے۔ جس دن یہ معاملہ طے پایا اسی دن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کی تقسیم کی قرارداد منظور کر لی۔اس کے نتیجے میں عربوں اور یہودیوں کے تعلقات سخت کشیدہ ہوگئے۔اس سب کے باوجود ڈاکٹر سکینک ان طوامیر اور مرتبانوں کو بیت اللحم سے یروشلم تک لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔یروشلم میں اسے چند مزید دستاویزات بھی مل گئیں۔

ڈاکٹر مِلر برّوز (Dr. Miller Burrows) امریکن سکول، یروشلم کے ڈائریکٹر اور عبرانی زبان کے ماہر

تھے۔ڈاکٹر برّ وز جب فروری ۱۹۴۸ء میں عراق کے دورے سے واپس آئے تو انھوں نے ان دستاویزات کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا۔انھوں نے پہلی پانچ دستاویزات میں سے ایک کو اپنے سکول کے نصاب میں شامل کر لیا۔ ڈاکٹر برّ وز نے آرچ بشپ سیموئیل کو بتایا کہ کتابِ یسیعاہ کا طومار غالباً بائبل کے قدیم ترین مخطوطے کا درجہ رکھتا ہے۔ جونہی آرچ بشپ کو یہ علم ہوا،اس نے ان مخطوطوں کو فلسطین سے باہر بھجوا دیا۔

۱۹۴۹ء کے آغاز میں آرچ بشپ امریکہ آئے اور یہ قیمتی دستاویزات بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ان دستاویزات کو آرچ بشپ نے تین سال کے لیے مشرقی علوم کے تحقیقی ادارے امیریکن سکول آف اورئینٹل ریسرچ کے حوالے کر دیا تاکہ انھیں شائع کیا جا سکے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری ڈاکٹر ملر بروز اور ان کے دو ساتھیوں ڈاکٹر ٹریور (Dr.Trever)اور ڈاکٹر براؤن لی (Dr. W.H.Brownlee) کو سونپی گئی۔

پہلی چار دستاویزات میں سے ایک کتابِ یسیعاہ پر مشتمل تھی۔ یہ عبرانی زبان میں تھی۔ دوسری دستاویز کتاب حبقوق کے پہلے دو ابواب پر مشتمل تھی۔ یہ بھی عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ تیسری دستاویز دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ یہ اس یہودی فرقے کے اپنے سماجی ضابطے کا دستور العمل تھا۔ چوتھا طومار وہ تھا جو ڈاکٹر برّ وز اور ان کے ساتھیوں سے کھولا نہ گیا تھا۔ اسے کافی عرصے کے بعد اس وقت کھولا گیا جب یہ اسرائیلی حکومت کی ملکیت میں آ گیا۔ ڈاکٹر ٹریور کی رائے کے مطابق یہ کتاب لامخ (Lameckh) تھی۔لیکن جب فروری ۱۹۵۶ء میں ماہرین اسے کھولنے میں کامیاب ہوئے تو انھوں نے بتایا کہ یہ کتابِ لامخ نہیں بلکہ کتابِ پیدائش (Genesis) کے ابواب پانچ سے پندرہ کا آرامی ترجمہ ہے جس میں لامخ کے ساتھ ساتھ بہت سی دوسری شخصیات جیسے ابراہیمؑ وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔

مندرجہ بالا پہلی چار دستاویزات کے علاوہ مزید تین دستاویزات پروفیسر سکینک کی ملکیت تھیں۔ان میں سے ایک حمدیہ نظموں پر مشتمل تھی جنھیں ''شکر گزاری کی حمدوں'' (Hymns of Thanksgiving) کا نام دیا گیا۔ دوسری کو پروفیسر سکینک نے ''ضابطۂ جنگ'' (The War of the Children of Light with the Children of the Darkness) کا نام دیا۔ اسے مختصراً "Rules of War" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ تیسری دستاویز میں کتاب یسیعاہ ہی کی ایک اور نقل تھی۔ اس میں باب ۴۱ سے بعد کی آیات تقریباً مکمل تھیں لیکن ابتدائی ابواب مکمل نہ تھے۔

اسی دوران آرچ بشپ سیموئیل امریکن سکول کے پروفیسر براؤن لی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پروفیسر براؤن لی نے ان طوامیر کی فوٹو کاپی کی اور انھیں واپس سینٹ مارک کی خانقاہ میں رکھ آئے۔ پہلے چند طوامیر کا بغور جائزہ لینے کے بعد پروفیسر براؤن لی نے ان ٹکڑوں میں موجود آیات پڑھیں اور پہچان لیا کہ یہ

www.javedahmadghamidi.com

کتاب یسیعاہ کی آیات ہیں۔اسی دوران دوسری تصاویر آ گئیں۔ان پر تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ کتابِ حبقوق کی تفسیر ہے۔کچھ عرصے کے بعد بشپ نے آرامی طومار کو پڑھنے کے لیے بھی علما سے رابطہ شروع کر دیا۔

پہلے غار سے دریافت ہونے والی ان دستاویزات کی اہمیت کے پیشِ نظر ماہرین نے ارادہ کیا کہ جلد از جلد اس علاقے کا اچھی طرح معائنہ کیا جائے۔ڈاکٹر بروز اور ان کے ساتھی ابھی یہ ارادہ کر ہی رہے تھے کہ عرب اسرائیل جنگ شروع ہو گئی۔ اقوام متحدہ کے بااختیار نمائندوں کی زیرِ نگرانی جب اسرائیل کی سرحدوں کا تعین ہوا اور ان کی نگرانی شروع ہوئی تو ان غاروں تک رسائی کی امید پیدا ہو گئی۔اتفاق سے اقوام متحدہ کے ایک بلجین (Belgean) نمائندے کیپٹن فلپ کی کوششوں سے ماہرین کی ایک ٹیم کی ان غاروں تک رسائی ممکن ہوئی۔اس ٹیم میں فادر ڈی واکس (De Vax)، ہارڈنگ (Harding) اور ان کے پندرہ ساتھی موجود تھے۔ہارڈنگ اور ڈی واکس تقریباً دو سال قبل بھی یہاں آئے تھے لیکن کوئی اہم دریافت نہ کر سکے تھے۔

۲۔خربۃ قمران (Khirbat Qumran) کی دریافت

ماہرین آثارِ قدیمہ نے بڑی احتیاط سے ایک اَور غار کی کھدائی شروع کی۔اس کا آغاز ڈاکٹر ملر برّوز کے بقول ۲۴ نومبر ۱۹۵۱ء کو ہوا۔ یہ کھدائی تقریباً تین ہفتے جاری رہی۔اس کھدائی کے دوران میں ایک بڑی عمارت کے آثار بھی ملے۔ یہ عمارت ۱۱۸ فٹ لمبی اور تقریباً ۹۶ فٹ چوڑی تھی۔اس کے علاوہ کئی گنبد بھی نکلے جو ساتھ والے ایک قبرستان کا حصہ تھے۔یہ آثارِ قدیمہ بہت پہلے سے خربۃ قمران (Khirbat Qumran) کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۹۵۱ء کے نومبر اور دسمبر میں خربۃ قمران میں تین کمروں کے آثار ملے۔مزید کھدائی پر یہاں سے ایک سکہ بھی برآمد ہوا۔ یہ تینوں کمرے پہلے غار میں موجود کمروں کے مشابہ تھے۔۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک مزید کھدائیاں جاری رہیں جس کے نتیجے میں نئے نئے حقائق سامنے آتے رہے۔[۱۱]

ان تحقیقات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ خربۃ قمران دراصل ایک بڑی اور منظّم جماعت کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ فادر ڈی واکس نے بھی اسی مؤقف کا اظہار کیا کہ یہ آثارِ قدیمہ دراصل اس یہودی معاشرے یعنی اسینیوں کا ہیڈ کوارٹر تھے جس کا ذکر پہلی صدی عیسوی کے رومی تاریخ دان پلائنی (Pliny) نے کیا تھا۔ پلائنی کے بقول یہ جماعت بحیرۂ مردار کے مغربی ساحل کی طرف آباد تھی۔

۳۔وادئ مربعات کی دریافت

نومبر ۱۹۵۱ء کے آخر میں بیت اللحم کے قدیم یادگاری اشیا کے ایک تاجر نے پیپرس (Papyrus) اور چمڑے کے چند

---

۱۱ Dr. Miller Burrows, p. 54.

ٹکڑے فادرڈی واکس کو پیش کیے۔اس کا دعویٰ تھا کہ یہ ٹکڑے ۱۹۴۷ء میں وادئ قمران کے پہلے غار ہی سے دریافت ہوئے تھے۔ یہ بات صریحاً غلط تھی۔ جب اس سے مزید پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے بتایا کہ یہ ٹکڑے ایک اور جگہ سے ملے تھے جو پہلے غار کے قریب ہی واقع ہے۔اسی دوران میں کچھ اور ٹکڑے بھی ادارۂ آثارِ قدیمہ اور فرنچ سکول میں لائے گئے۔ان میں سے بعض تو چمڑے پر لکھے ہوئے تھے اور بعض پیپرس پر۔ان میں سے کچھ عبرانی زبان میں تھے، کچھ آرامی میں تھے اور کچھ یونانی میں۔ فادرڈی واکس ان دستاویزات کے سرچشمے تک پہنچنا چاہتا تھا۔اس نے بڑی چابکدستی سے ان بدوؤں کے ساتھ بات چیت اور سودے بازی جاری رکھی اور بالآخر انھیں تعاون پر آمادہ کرلیا۔اس معاملے میں کافی وقت لگ گیا اور بالآخر ۲۱ جنوری ۱۹۵۲ء کو فادرڈی واکس اور ہارڈنگ ایک تجربہ کار عرب فورمین، بیت اللحم کے ایک پولیس افسر، دو سپاہیوں اور دو بدو راہ نماؤں کے ساتھ اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں کچھ بدو پہلے ہی مصروفِ کار تھے۔ یہ مقام درحقیقت وادئ قمران سے دس گیارہ میل جنوب میں کچھ غاروں پر مشتمل تھا۔ یہ مقام وادئ مربعات کے نام سے مشہور تھا۔محکمۂ آثارِ قدیمہ اور فرانسیسی ادارے فرنچ سکول آف آرکیالوجی (French School of Archeology) نے مشترکہ طور پر دوبارہ کھدائی کا کام شروع کر دیا۔اس مشترکہ مہم نے ۱۹۵۲ء کے ابتدائی چھ ماہ میں مجموعی طور پر چھ ہفتے کھدائی کی۔اس کے نتیجے میں چند مسودات کے اجزا اور سکوں کی ایک بڑی مقدار دریافت ہوئی۔[۱۲]

یہاں سے دریافت ہونے والے سکے اور دستاویزات کے ٹکڑے رومیوں کے خلاف یہودیوں کی دوسری بغاوت (۱۳۲ تا ۱۳۵ء) کے دوران اور اس سے کچھ پہلے تک کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان دستاویزی اجزا میں بائبل کی کتابوں کے بہت مختصر مواد پر مشتمل چھوٹے چھوٹے ٹکڑے صرف چند ایک ہی دستیاب ہوئے۔ جن میں سے کچھ کتابِ پیدائش اور کتابِ خروج کے ہیں اور ایک ایک کتابِ استثنا اور کتابِ یسعیاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ان میں رسوم وعبادت، عملیات اور تعویذات کا ایک مکمل طومار (Phylactery) بھی شامل تھا۔ جو یہودیہ کے مذہبی رسوم کی تاریخ کے لحاظ سے ایک مفید مأخذِ معلومات ہے۔[۱۳]

۴۔مزید غاروں کی دریافت

وادئ مربعات کے ان غاروں کی دریافت کے بعد کچھ عرصے کے لیے مزید دریافتوں کا سلسلہ رکا رہا۔تاہم مقامی باشندوں نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے مزید غار بھی موجود ہوں گے۔ چنانچہ وادئ قمران اور اسکے نزدیک پانی کے راستوں پر تلاش کا سلسلہ جاری رہا۔ان بدوؤں کو اپنی دریافتوں کے بدلے میں معاوضہ بھی خوب ملتا

۱۲؎ Dr. Miller Burrows, p. 57.

۱۳؎ Ibid., p. 56-58.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تھا۔انفرادی طور پر ان غاروں کی کھدائی غیر قانونی فعل تھا اور حکومت کے لیے ضروری تھا کہ باقاعدہ طور پر اس علاقے میں کھدائی کا کوئی باضابطہ طریقہ کار مقرر کرے۔ متعدد اداروں کے اربابِ تحقیق اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین پوری دنیا سے یہاں تحقیق و دریافت کے لیے آ رہے تھے۔اس کا نتیجہ دس غاروں کی صورت میں ظاہر ہوا جو پوری وادی قمران میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان غاروں میں چمڑے اور کاغذ کے ٹکڑے، سکے اور مٹی کے مرتبان بھی ملے۔ بعد میں ان تمام غاروں کو یکسانیت، سہولت اور باقاعدگی کی غرض سے ترتیب وار نمبر دے دیے گئے۔ سب سے پہلے غار کا مختصر نام 1Q قرار پایا اور اسی طرح 2Q, 3Q--- یہاں Q قمران کے لیے مخفف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

ان میں سے تیسرے غار یعنی 3Q میں بقیہ غاروں سے مختلف اور منفرد چیز دریافت ہوئی۔ یعنی تانبے کا ایک طومار۔اس طومار کے دو اجزا تھے۔ان میں سے ایک طومار مزید دو پٹیوں پر مشتمل تھا۔ان پٹیوں کے باہر کی طرف کچھ نہ لکھا گیا تھا، جبکہ اندر کی طرف لکھی ہوئی عبارت کو پڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ ان طوماروں کو کھولنا بہت مشکل تھا۔ ان کا تانبا کیمیائی عمل (oxidation) کی وجہ سے بالکل جڑ گیا تھا۔ان کو آسانی کے ساتھ کھولنے کے لیے مزید چند سال انتظار کیا گیا۔ آخر کار ۱۹۵۶ء میں پروفیسر بیکر (H.Write Baker) کی زیرِ نگرانی مانچسٹر کالج آف ٹیکنالوجی میں انھیں بڑی احتیاط کے ساتھ کاٹا اور ان کی تصاویر لی گئیں۔ان کو کھولنے کے بعد ظاہر ہوا کہ ان میں تین ہزار الفاظ تھے۔ یہ کام اتنی احتیاط کے ساتھ کیا گیا کہ پورے طومار کا صرف پانچ فیصد ہی ضائع ہوا جبکہ باقی حصہ محفوظ کر لیا گیا۔ان طوماروں کے متن کا اعلان ۳۱ مئی ۱۹۵۶ء کو مانچسٹر اور عمان سے بیک وقت کیا گیا۔ان طوامیر میں ان خفیہ مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں پر سونے اور چاندی کے خزانے مدفون تھے۔متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خزانے وادی قمران سے پچاس میل کے فاصلے پر چھپائے گئے تھے، لیکن زیادہ تر دفینوں کی نشاندہی یروشلم کے آس پاس ہی کی گئی تھی۔[۱۴]

وادیٔ قمران کی ان دریافتوں کی معراج چوتھے غار کی دریافت تھی۔ یہ غار اب 4Q کے نام سے موسوم ہے۔اس غار میں سب غاروں سے زیادہ طوامیر ملے ہیں اسی لیے یہ سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے۔اس غار پر کھدائی کا کام ۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء کو شروع ہوا۔ اس غار پر بہت محنت سے کام ہوا۔ قدیم نوادرات اور ڈومینیکنز کے شعبے (Dptt. of Antiquities and Dominicans) نے امیریکن سکول آف اورئینٹل ریسرچ (American School of Oriental Research) کے تعاون سے ان کی شناخت، درجہ بندی اور کیٹیلاگ سازی کا کام سرانجام دیا۔[۱۵]

اس غار میں کتابِ ایستر (Esther) کے سوا عہد نامہ قدیم کی تقریباً تمام کتب کا کچھ نہ کچھ حصہ دستیاب ہوا

---

۱۴ Dr. Miller Burrows, p. 60.

۱۵ Dr. Miller Burrows, p. 62.

ہے۔لیکن کتبِ توراۃ (بائبل کی پہلی پانچ کتابیں، جنھیں اسفارِخمسہ (Pentateuch) بھی کہا جاتا ہے)اور کتابِ یسعیاہ کے بڑے حصوں کے مسودات سب سے زیادہ تعداد میں دستیاب ہوئے۔اسی طرح مزامیر (Psalms) ،کتابِ دانیال(Daniel) اور کتابِ یرمیاہ(Jeremiah) کے بھی کئی ٹکڑے ملے۔اس غار سے چند تفسیریں بھی ملی ہیں مثلاً مزامیر، یسعیاہ اور چند چھوٹے رسولوں کی کتب کی تفسیریں۔ وادیٔ قمران میں رہنے والے فرقے کی بعض اپنی دستاویزات بھی اس غار سے ملی ہیں مثلاً سماجی ضابطہ ,(Manual of Discipline)، شکر گزاری کی حمدیں(Thanksgiving Hymns)۔ان کا متن پہلے غار سے دریافت ہونے والی دستاویزات کے متن سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سے "War Rules" بھی دستیاب ہوئے۔ اپوکراائفا (Apocrypha) کی کتابِ طوبیاہ (Tobit) کے عبرانی اور آرامی دونوں زبانوں کے نسخے بھی ان میں موجود ہیں۔ اس غار سے چند دوسری دستاویزات بھی ملی ہیں جن میں اس فرقے کی اپنی تعلیمات درج تھیں، مثلاً دستاویزاتِ دمشق(Damascus Documents)اور مکاشفاتی لٹریچر (Apocalyptic Literature) ۔ یہ تمام تحریریں اس خطے کے مذہبی گروہ (اسینیوں) کی اپنی تحریر کردہ تھیں۔اور وہ ان دستاویزات میں محفوظ تعلیمات پرسختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔

۵۔خربۃ مِرد(Khirbat Mird)

یہ علاقہ بحیرۂ مردار سے مغرب میں ۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ یروشلم کے شمال مشرق میں ۹ میل کے فاصلے پر وادیٔ قمران اور وادیٔ مربّعات کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ یہ علاقہ کسی زمانے میں ہاسمونیوں (Hasmonians) کا قلعہ تھا۔ بعد میں یہ جگہ مسیحی خانقاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں تعمیر یہ قبیلے کے بدوؤں کو یہاں سے چند طوامیر ملے۔ یہ طوامیر قمران سے ملنے والے طوامیر سے کافی بعد کے زمانہ کے تھے۔ یہاں سے پیپرس پر عربی زبان میں لکھا ہوا ایک خط بھی دستیاب ہوا۔ یہ خط ساتویں / آٹھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا تھا۔ پیپرس ہی پر تحریر شدہ ایک اور خط ملا جو سُریانی زبان میں لکھا گیا تھا۔ یہاں سے کثیر تعداد میں عہد نامہ قدیم و جدید کے متن پر مشتمل یونانی اور فلسطینی سریانی زبان میں تحریر کردہ مسودے دستیاب ہوئے ہیں۔مزید برآں خربۃ مِرد کے ان کھنڈرات سے پانچویں سے آٹھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے چند مسودے دستیاب ہوئے ہیں جن پر عہد نامہ جدید کی چند کتب پر مشتمل عبارات درج تھیں۔ان کتب میں انجیل مرقس، یوحنا اور کتابِ اعمال شامل ہیں۔ یہ تمام مسودے یونانی زبان میں مرقوم تھے۔البتہ انجیلِ لوقا، یوحنا اور اعمال کے کچھ مزید مسودے فلسطینی سریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ان کے علاوہ عہد نامہ قدیم کی کتابِ یوشع کے بھی چند مسودے ملے ہیں جو سریانی زبان

میں مرقوم تھے۔ یہ واحد علاقہ ہے جہاں سے نکلنے والے مخطوطوں کا تعلق مسیحیت سے بھی ہے جبکہ بقیہ تمام مخطوطے صرف یہودیت سے تعلق رکھتے تھے۔[۱۶]

۶۔مسادا(Masada)

بحیرۂ مردار کے جنوب میں ایک قلعہ کے کھنڈرات دریافت ہوئے۔ یہ قلعہ چٹانی پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اسے مسادا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ علاقہ ۶۶ء میں یہودی فرقے زیلوٹس (Zealots) کے قبضے میں تھا۔ جوزیفس نے زیلوٹس کی رومیوں کے خلاف جدوجہد کا ذکر کیا ہے۔اس علاقے کی چھان بین اسرائیلیوں نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۵ء تک کی۔ یہاں سے ملنے والے مخطوطوں میں آرامی زبان میں لکھے گئے تجارتی معاہدے شامل ہیں۔ جن میں رقوم کی لین دین کے معاملات درج ہیں۔ کتابِ زبور کی چند آیات اور قمران کے چوتھے غار سے نکلنے والی ''عبادت سے متعلق دستاویزات'' کی ایک نقل بھی یہاں سے دستیاب ہوئی۔اس جگہ سے ملنے والی دستاویزات نے لوگوں میں شک پیدا کیا کہ قمران کے رہائشی دراصل یہی زیلوٹس فرقے کے لوگ تھے۔لیکن جیسا کہ جوزیفس نے لکھا ہے کہ اسینیوں نے رومیوں کے خلاف جنگ کی اور ۶۸ء میں قمران کی تباہی کے بعد غالباً کچھ اسینی لوگ مسادا کی طرف آ گئے۔اس طرح اس شک کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے کہ قمران کے رہائشی اسینی نہیں بلکہ زیلوٹس تھے۔[۱۷]

۷۔وادئ خبرا(Nahal Hever)

یہ وادی عین جدی سے تین میل جنوب اور مسادا سے سات میل شمال میں واقع ہے۔[۱۸] مشہور یہودی عالم یادن (Y.Yadin) نے یہاں سے بڑی اہم دستاویزات حاصل کی ہیں۔ یہ دستاویزات یہودیوں کی رومیوں کے خلاف دوسری بغاوت (۱۳۲ء-۱۳۵ء) کے وقت یہاں موجود تھیں۔ پیپرس پر لکھے ہوئے ۱۵ خطوط پانچویں رچھٹے غار سے دستیاب ہوئے۔ یہ خطوط آرامی، عبرانی اور یونانی زبانوں میں لکھے گئے تھے۔اسی وادی کے ایک اور غار (غار نمبر ۸) سے چھوٹے انبیا کے متن پر مشتمل ایک طومار کے چند ٹکڑے دستیاب ہوئے۔ یہ یونانی زبان میں لکھے گئے تھے۔[۱۹]

۱۶؎ F.F.Bruce, ***Second Thoughts on the Dead Sea Scrolls***, p. 57.

۱۷؎ ***The New Jerome Biblical Commentary***, Theological Pub.in India, Banglore, (1994), pp. 1078.

۱۸؎ ***Ibid.***

۱۹؎ ***Ibid.***

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۸۔وادیٔ سیپال (Nahal Se'elim, present name Wadi Seiyal)

وادیٔ سیپال عین جدی سے ۸میل جنوب اور مسادا سے اڑھائی میل شمال میں واقع ہے۔۱۹۶۰ء میں بھیجی گئی ایک مہم کو یہاں سے چند دستاویزات ملیں۔ان غاروں میں بارکوکبہ کے سپاہیوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ چند دوسری دستاویزات کے ساتھ کتابِ خروج کا ایک حصہ (۱۳:۲-۱۰) بھی یہاں سے دستیاب ہوا۔ یہ عبرانی زبان میں لکھا گیا تھا۔اس دستاویز کا متن ہفتادی ترجمے کے اساسی عبرانی متن سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔[۲۱]

۹۔جدید دریافتیں

۱۹۷۰ء کے عشرے میں دستاویزاتِ بحیرۂ مردار سے متعلق تحقیق مختلف پہلوؤں سے کی جارہی تھی۔اولاً یہ کہ نئی دریافتوں کی تلاش جاری رکھی جائے۔ثانیاً یہ کہ پہلے سے معلوم شدہ ان دستاویزات سے اخذ کردہ نتائج میں مزید بہتری لائی جائے۔ ثالثاً یہ کہ شناخت ہونے والی دستاویزات کی درجہ بندی اوراشاعت کا بندوبست کیا جائے۔لہٰذا اس دہائی میں عین الغویر (En El-Ghuweir) کی دریافت نے پہلے سے تسلیم شدہ اس مفروضے کو مزید تقویت فراہم کی کہ قمران کے رہائشی اسینی ہی تھے۔

بحیرۂ مردار کے ساحل پر قمران کے جنوب میں عین الغویر کے مقام پر کھدائی کے دوران چند نئے کھنڈرات کے آثار ملے۔اس دریافت کا سہرا بارایدن (Bar-Adon) کے سر ہے۔بارایدن کے بقول ان کھنڈرات سے جس آبادی کی نشاندہی ہوتی ہے وہ قمران کی آبادی کی ہم عصر تھی۔دونوں جگہ بڑی عمارتوں کے آثار ملے ہیں جو واضح طور پر اجتماعی سرگرمیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔عین الغویر کے ان کھنڈرات سے متصل ایک قبرستان کے آثار ملے ہیں۔ اس قبرستان کی بعض نمایاں خصوصیات قمران کے پاس موجود قبرستان سے بہت حد تک مماثل ہیں۔قمران کی طرح یہاں کے قبرستان سے بھی عورتوں اور بچوں کے ڈھانچے ملے ہیں۔مذکورہ بالا خصوصیات کا تذکرہ کرنے کے بعد بارایدن اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ عین الغویر کی یہ آبادی دراصل اسینیوں ہی کی ایک آبادی تھی۔[۲۲]

ان نتائج کے بغور مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض اسینی ایسے بھی تھے جو عائلی زندگی گزارتے تھے۔مشہور مؤرخ جوزیفس نے بھی شادی کرنے والے اسینیوں کا ذکر کیا ہے۔[۲۳]

(جاری)

---

۲۰ *Ibid.*

۲۱ ***The New Jerome Biblical Commentary***, p. 1078.

۲۲ ***Encyclopaedia Judaica***, (Under Entry, dead-sea-scrolls), p. 6.

۲۳ Dr. Miller Burrows, p. 62.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

دیوبند کانفرنس اور مذہبی سیاست

دیوبند کانفرنس کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ یہ ایک مخصوص مذہبی عصبیت رکھنے والوں کا اجتماع تھا جن کے پیشِ نظر اپنی سیاسی قوت کا اظہار تھا۔ تاہم، ہمارے نزدیک، چند اور پہلوؤں سے بھی اس اجتماع کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ان میں سب سے اہم مذہبی عصبیت اور عملی سیاسی حقائق کا تعلق ہے۔ ہمارے ہاں یہ وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں مذہبی جماعتیں ایک عرصہ سے ابہام کا شکار ہیں۔ وہ ان دونوں کے باہمی تعلق کو درست تناظر میں نہیں دیکھ سکیں جس کے باعث ملکی سیاست میں ان کا عملی کردار دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔

دیوبند ہماری تاریخ میں ایک مذہبی فکر کا عنوان ہے اور ایک سیاسی موقف کا بھی۔ مذہبی اعتبار سے یہ تصوف و حنفیت کے اس امتزاج کا نام ہے جو اپنا تعلق اس روایت سے جوڑتا ہے جس کے اہم سنگِ میل شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور امداد اللہ مہاجر مکی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے اس کا سب سے نمایاں حوالہ جمعیت علماے ہند ہے، اگرچہ ریشمی رومال کی تحریک، تحریکِ خلافت اور اس سے قبل ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو بھی یہ اپنی سیاسی تاریخ کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ تقسیمِ ہند سے قبل یہ دونوں روایات ایک ساتھ آگے بڑھتی رہیں اور انھیں اس حوالے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ جو لوگ ان کے مخاطب تھے، ان کے سیاسی مفادات ایک تھے۔ اس دور میں تقسیمِ کار کا ایک نقشہ سامنے آتا ہے جس کے تحت علمی وفکری پہلو سے دارالعلوم دیوبند اور اس سے متعلق دینی مدارس کا ایک نظام متحرک تھا، سیاسی امور کو جمعیت علماے ہند کے فورم سے اٹھایا جاتا تھا اور تبلیغی و دعوتی کام مولانا محمد الیاس کے قافلے نے سنبھال لیا، جسے ہم تبلیغی جماعت کے نام سے جانتے ہیں۔ تقسیمِ کار کے اس نظام سے بھی مذہبی و سیاسی مطالبات کا تفاوت اتنا نمایاں ہو کر سامنے نہیں آیا جو ہمیں بعض دیگر معاصر مذہبی جماعتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

تقسیمِ ہند نے سیاسی اعتبار سے معاملات کی نوعیت کو یکسر بدل دیا۔ اس حوالے سے دیوبندی عصبیت کے حامل تقسیم سے پہلے ہی دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک کانگریس کا ہم نوا تھا اور دوسرا مسلم لیگ کا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایک فطری تقاضے کے تحت وابستگانِ دیوبند مستقل طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ پاکستان میں بسنے والوں نے اپنے لیے جمعیت علماے اسلام

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا نام منتخب کیا جبکہ بھارت کے دیو بندی پرانے نام ہی سے منظّم رہے۔ مذہبی جماعتوں میں تقسیم کی یہ واحد مثال نہیں ہے۔ جماعتِ اسلامی سمیت بعض دیگر جماعتیں بھی اس عمل سے گزری ہیں۔ تقسیمِ ہند اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس کے بعد یہ جماعتی تقسیم ناگزیر تھی۔ اس تقسیم سے ان جماعتوں کے مذہبی موقف میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی، لیکن سیاسی اعتبار سے انھیں مجبوراً مقامی حالات کے تابع ہونا پڑا۔ بھارت میں بسنے والوں کو بہر حال، بھارت ہی کا وفادار ہونا تھا اور پاکستان میں رہنے والوں کو پاکستان کا۔

یہ معاملہ اتنا سنگین نہ ہوتا اگر پاکستان اور بھارت کے باہمی مفادات متصادم نہ ہوتے۔ مفادات کے اس تصادم نے دونوں اقوام کو ایک دوسرے کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ اب بھارت کے حق میں کلمۂ خیر کہنا پاکستان میں حبِ وطن کے برخلاف تھا اور یہی معاملہ بھارت کے شہریوں کے لیے تھا، قطعِ نظر اس بات سے کہ ان کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اس کی سب سے اہم مثال مسئلۂ کشمیر ہے۔ زیرِ نظر دیو بندی کانفرنس میں یہ مسئلہ پوری شان سے اٹھا۔ اس کانفرنس میں چونکہ بھارت سے آنے والے علما بھی شریک تھے، جن میں دارالعلوم دیو بند کے مہتمم بھی شامل تھے، اس لیے یہاں اس رائے کا اعادہ نہ کیا جا سکا جو اس باب میں پاکستان کے دیو بندی حلقے رکھتے ہیں۔ اس وقت جو لوگ یہ موقف رکھتے ہیں کہ مسئلۂ کشمیر کا حل عسکری جدوجہد یا جہاد میں ہے، ان میں سب سے نمایاں گروہ خود کو دیو بند مدرسے سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر حرکت الانصار اور جیشِ محمد۔ یہ لوگ اپنے اس کارنامے کو نمایاں طور پر بیان کرتے ہیں کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں ہونے والی آزادی کی عسکری جدوجہد میں سب سے زیادہ شریک ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ موقف ان دیو بندی حضرات کا نہیں جو ہندوستان میں ہیں۔ وہ یا تو اسے جہاد نہیں سمجھتے یا اس باب میں مکمل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اگر ان کے حالات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اس طرزِ عمل پر تنقید کا کوئی جواز نہیں۔ ان کے پیشِ نظر ان کروڑوں مسلمانوں کا مفاد ہے جو اس وقت بھارت کے شہری ہیں۔ وہ کوئی ایسا موقف علانیہ اختیار نہیں کر سکتے جو بھارت کے قومی مفادات سے ٹکراتا ہو یا اس کے سرکاری موقف سے مختلف ہو۔ یہ لوگ بھارت کے شہری ہونے کے ناطے اپنی ریاست سے محبت رکھتے اور اس کے خیر خواہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ اس توجیہ کے باوجود یہ عملی حقیقت تو اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ مسئلۂ کشمیر پر پاکستان کے دیو بندی ایک رائے رکھتے ہیں اور بھارت کے دیو بندی دوسری...... جہاں تک مذہبی عقائد اور آرا کا تعلق ہے تو انھیں اس معاملے میں کسی طرح کا تفاوت محسوس نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ دارالعلوم دیو بند کوئی فتویٰ دے اور یہاں کے دیو بندی اسے قبول کر لیں یا پاکستان کے کسی مدرسے، مثال کے طور پر بنوری ٹاؤن کراچی یا اکوڑہ خٹک کے دارالافتا کا فتویٰ بھارت کے دیو بندیوں کے لیے بھی قابلِ اتباع ہو۔ گویا مذہبی معاملات میں ایک رائے رکھنے کے باوجود وہ سیاسی معاملات میں مختلف الرائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی تقاضے دوسرے ہیں اور علمی تقاضے دوسرے۔ اس

کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علمی اور سیاسی کام ایک پلیٹ فارم سے نہیں کیے جا سکتے۔ کیونکہ ان کے مطالبات ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ بعض اوقات متصادم بھی ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ مسئلہ ان لوگوں کو بھی درپیش ہے جنھوں نے علمی اور سیاسی کام ایک ہی نظم کے تحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر علمی کام ایک فکری عصبیت پر منتج ہوتا ہے۔اب اگر کسی علمی کام کے ساتھ کسی اجتماعیت کو منظّم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ لازماً ایسے لوگوں ہی کا اجتماع ہوگا جو اس خاص علمی نقطۂ نظر کے حامل ہوں گے۔اس کے برخلاف سیاسی کام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ پوری قوم کو ساتھ لے کر چلے اور اس میں تمام نقطہ ہاے نظر کے لوگ خود کو اجنبی محسوس نہ کریں۔ یہ صلاحیت ایسی جماعت میں ہوسکتی ہے جو کوئی خاص علمی عصبیت نہ رکھتی ہو اور قومی دلچسپی کے امور پر لوگوں کو مجتمع کرنے کی علم بردار ہو۔آج پاکستان میں کوئی مذہبی سیاسی جماعت ایسی نہیں جو اپنا مخصوص علمی و دینی پس منظر نہ رکھتی ہو۔ چنانچہ جب وہ اپنے دامن کو وسعت دینا چاہتی ہے تو یہ پس منظر اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن بھی اس بات کے علم بردار ہیں کہ جمعیت علماے اسلام کسی خاص مذہبی فکر کی حامل جماعت نہیں، بلکہ ایک سیاسی پلیٹ فارم ہے جو پوری قوم کو ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ قومی و سیاسی امور ہی پر اظہارِ خیال کریں اور علمی و مذہبی موضوعات پر کوئی رائے نہ دیں۔ ممکن ہے کہ ان کا یہ دعویٰ درست ہو،لیکن کیا اس قوم کے دیگر طبقات یہ باور کرنے کے لیے تیار ہیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔خود اس کانفرنس کا عنوان اس بات کا اعلان ہے کہ وہ اصلاً ایک خاص مذہبی پس منظر رکھنے والے لوگوں کا گروہ ہے۔ چنانچہ وہ کسی ایسے شخص کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتے جو بریلوی،شیعہ یا اہلِ حدیث فکر کا حامل ہے۔

اس بات کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ آج اہلِ تشیع اور بریلوی حضرات کے بارے میں جن جماعتوں نے انتہا پسندانہ موقف اختیار کیا ہے، انھوں نے دیوبندی مدارس ہی سے جنم لیا ہے۔سپاہِ صحابہ کے بانی مولانا حق نواز جھنگوی نہ صرف دیوبندی تھے، بلکہ جمعیت علماے اسلام کے بھی عہدے دار تھے۔ چند ماہ پہلے کراچی میں دہشت گردی کا شکار بننے والے مولانا محمد یوسف لدھیانوی اس عہد کے دیوبندی علما میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔اہلِ تشیع کے بارے میں ان کا موقف وہی تھا جو سپاہِ صحابہ کا ہے۔اس کے برخلاف جمعیت علماے اسلام جب ایک سیاسی فورم کی جگہ پر کھڑی ہوتی ہے تو وہ یہ موقف اختیار نہیں کرتی۔ دیوبند کانفرنس میں ایران سے ایک وفد شریک ہوا اور اس میں شیعہ سنی تقسیم کو مسلمان دشمنوں کی سازش قرار دیا گیا۔سوال یہ ہے کہ اس تضاد کی کوئی توجیہ کیا ممکن ہے؟

اس طرح کے تضادات کا شکار صرف جمعیت علماے اسلام نہیں ہے، بلکہ ہر وہ جماعت ہے جو کسی خاص مذہبی عصبیت یا فکر کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ کیا جناب طاہر القادری اپنے بریلوی پس منظر کو خود سے جدا کر سکتے ہیں؟ جماعتِ اسلامی نے خود کو شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی کی تقسیم سے تو بلند کر لیا، لیکن کیا وہ مولانا مودودی کی فکر سے بھی دامن چھڑا سکتی ہے؟ یقیناً ایسا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نہیں ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن اگر یہ چاہتے ہیں کہ ان کی جماعت قومی جماعت بنے تو انھیں اس دیوبندی عصبیت سے باہر آنا ہوگا۔ طاہر القادری صاحب اگر قومی رہنما بننا چاہتے ہیں تو انھیں اس شخصیت سے جان چھڑانا ہوگی جس سے لوگ ایک بریلوی عالم کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ قاضی حسین احمد صاحب اگر کسی قومی فورم کو وجود میں لانا چاہتے ہیں تو اس کا نام یقیناً جماعتِ اسلامی نہیں ہوسکتا۔ کسی سیاسی کامیابی کے لیے ان لوگوں کو اپنے مخصوص مذہبی پس منظر سے باہر آنا ہوگا اور اصولاً اسی طرح سیاست کرنا ہوگی جس طرح مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ان حضرات کے لیے ممکن ہے؟

علمی کام اور سیاسی کام کے یہ تضادات ہیں، جن کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں یہ مذہبی جماعتیں ہر طرح کے حربے استعمال کرنے کے باوجود، وہ سیاسی عصبیت حاصل نہیں کرسکتیں جو پیپلز پارٹی یا جناب نواز شریف کی قیادت میں مسلم لیگ کو حاصل ہوئی تھی۔ اس مسئلے کا حل حکمتِ عملی میں تلاش کرنے کے بجائے اگر یہ مذہبی جماعتیں اپنی ہیئتِ ترکیبی پر غور کرتیں تو انھیں اصل خرابی کے بارے میں معلوم ہو جاتا اور وہ اپنی توانائیاں کسی سعیِ لا حاصل پر صرف نہ کرتیں۔ یہ بات بھی اب تجربات سے ثابت ہو چکی ہے کہ سیاسی اور مذہبی عصبیتیں الگ الگ وجود رکھتی ہیں۔ ایک آدمی اگر مذہبی اعتبار سے دیوبندی ہے تو یہ کچھ لازم نہیں کہ وہ سیاسی طور پر جمعیت علماے اسلام سے وابستہ ہو یا اگر کوئی شخص شیعہ ہے تو وہ ہر صورت میں تحریکِ جعفریہ کا رکن ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی ہر طرح کی عصبیت سے محروم ہوتیں کیونکہ وہ کسی مذہبی عصبیت کی نمائندہ نہیں ہیں۔ دیو بند کانفرنس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی تھی، لیکن اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ یہ لوگ سیاسی اعتبار سے بھی وہی موقف رکھتے ہیں جو مولانا فضل الرحمٰن کا ہے۔

گزشتہ پچاس برسوں میں ہمارے ہاں بہت سے لوگوں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ کسی موجودہ مذہبی عصبیت کو سیاسی عصبیت میں بدل دیں یا پہلے ایک نئی مذہبی و علمی عصبیت پیدا کریں اور پھر اسے سیاسی عصبیت میں تبدیل کردیں۔ ان سارے تجربات پر اگر نظر ڈالیں تو معاملہ وہی نظر آتا ہے کہ:

سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

دیوبندی کانفرنس میں مسئلۂ کشمیر پر سامنے آنے والے اختلاف سے سیاسی اور عملی کام کے مختلف تقاضے ایک بار پھر نمایاں ہو گئے ہیں، اس لیے جب تک سیاسی اور علمی کام کے اس تفاوت کو نہیں سمجھا جائے گا اور جب تک لوگ یہ نہیں مانیں گے کہ سیاست اہلِ سیاست ہی کا کام ہے، ہمارے مذہبی لوگ سیاست کے صحرا میں بھٹکتے رہیں گے۔ اس صحرا نوردی کا انجام کسی چشمِ بینا سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ وصالِ یار کا تو خیر کیا امکان، اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی کب کی نیلام ہو چکی ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

ڈاکٹر محمد فاروق خان

طالبان کی بت شکنی

افغانستان میں طالبان انتظامیہ کی جانب سے مہاتما بدھ کے ڈھائی ہزار سال قبل کے مجسمے کو مسمار کرنے سے ایک اہم اصولی سوال نے جنم لیا ہے۔ وہ یہ کہ غیر مسلموں کے مقدس مقامات، ان کے قابلِ تعظیم شعائر اور تاریخی اہمیت کے حامل اصنام کے متعلق اسلام کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ کیا وہ ان سب کو توحید کی روح کے خلاف قرار دے کر مسمار کرنے کی ہدایت دیتا ہے یا ان کا احترام کرتا ہے؟ فی الوقت طالبان کا موقف یہ ہے کہ ہر وہ بُت جو کسی نمایاں یا پبلک مقام پر ایستادہ ہو، اسے مسمار کرنا لازم ہے۔ تاہم غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے اندر موجود بتوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ اسی لیے ہم نے نمایاں مجسمے ملیامیٹ کر دیے، تاہم ہمارے زیر انتظام علاقوں میں مندر اور گردوارے موجود ہیں اور ان کو کچھ نہیں کہا گیا۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

طالبان کے اس اقدام کی حمایت میں چار بنیادی دلائل پیش کیے گئے ہیں:

پہلی دلیل یہ ہے کہ بتوں کو توڑنا سنت ابراہیمی ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضورؐ نے بتوں کو توڑا تھا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ عظیم حکمران محمود غزنوی نے سومنات میں بت کو توڑا تھا۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ یہ دراصل پوری دنیا میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کا بدلہ ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں ظلم وستم کا بازار گرم ہے۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے کسی ایسے اقدام کی ضرورت ہے جس سے ان ظالموں کو بھی تکلیف پہنچے۔

ان دلائل پر تفصیلی تجزیہ تو اس تحریر میں آگے آئے گا، لیکن چند امور تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ پہلی دلیل کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عبادت گاہ کے اندر جا کر بتوں کو توڑا تھا، اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے اندر موجود بتوں کو توڑنا ضروری ہے، جبکہ طالبان کہتے ہیں کہ وہ عبادت گاہوں کے اندر موجود بتوں کو نہیں توڑیں گے۔ دوسری دلیل کے ضمن میں بھی یہ بات واضح ہے کہ حضور نے اپنے زیرِ نگیں علاقوں میں نہ صرف یہ کہ تمام بتوں کو مسمار کر دیا تھا، بلکہ مشرکین کی تمام عبادت گاہوں کو ملیامیٹ کر دیا تھا[1]۔ چنانچہ آپ کے اس اقدام سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کی تمام عبادت گاہوں کو مٹانا بھی ضروری ہے۔ جب کہ اس کے برعکس طالبان کہتے ہیں کہ

۱؎ تفسیر ابن کثیر (اردو) ج ۵، ص ۲۴۸-۲۴۷۔

وہ مشرکین کی عبادت گاہوں اور ان کے اندر موجود بتوں کی حفاظت کریں گے۔ جہاں تک تیسری دلیل یعنی محمود غزنوی کے نقشِ قدم پر چلنے کا تعلق ہے، اس ضمن میں ایک بات تو یہ ہے کہ سومنات کا بت بھی مندر کے اندر تھا، باہر نہیں تھا۔[۲] اس لیے اس سے بھی طالبان کے نقطۂ نظر کی تائید نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ محمود غزنوی کے زیرِ نگیں علاقے میں تو ہزاروں جگہ بت موجود تھے۔ اس ایک بت کے علاوہ تو اس نے کسی بت کو نہیں توڑا۔ جہاں تک چوتھی دلیل کا تعلق ہے تو یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ جن ممالک میں بدھ مت کا اثر زیادہ ہے، وہی ممالک عالمِ اسلام، خصوصاً افغانستان اور پاکستان کو سب سے زیادہ امداد دیتے ہیں۔ اور انھوں نے عام طور پر مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ان میں جاپان، کوریا، چین، تھائی لینڈ وغیرہ شامل ہیں۔ گویا اس اقدام سے طالبان نے دشمنوں کے بجائے دوستوں کو اپنے آپ سے دور کر لیا ہے۔ یعنی پشتو ضرب المثل کے مطابق ''گدھے کے بجائے کمہار کو داغ دیا ہے۔''

درج بالا دلائل میں پنہاں اسی کمزوری کی وجہ سے ''لشکرِ طیبہ'' نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہر مسلمان کے لیے ہر آلۂ شرک کو ضائع کرنا اور ختم کرنا ضروری ہے اور مسلمانوں کا جہاں بھی قبضہ ہو وہاں وہ مشرکین کی تمام عبادت گاہوں کو مسمار کر سکتے ہیں۔[۳] لیکن اس موقف کی کمزوری بھی بادنیٰ تامل یوں واضح ہوتی ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کو دس ہدایات دی تھیں۔ ان ہدایات کو تمام مورخین و محدثین نے نقل کیا ہے۔ ان ہدایات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ غیر مسلموں کی کسی عبادت گاہ کو مسمار نہ کیا جائے اور راہبوں و عابدوں کو نہ ستایا جائے۔ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ خلفاے راشدین کے زمانے میں جزیرہ نماے عرب سے باہر لاکھوں مربع میل کے علاقے فتح ہوئے، مگر کبھی کسی مندر یا بت کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ ظاہر ہے کہ خلفاے راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم اسلام کو آج کے دور سے بہتر جانتے تھے۔

چنانچہ اب ہمیں اس سوال کا علمی لحاظ سے جائزہ لینا ہے کہ غیر مسلموں کے مقدس مقامات، ہستیوں، ان کی مورتوں اور ان کی عبادت گاہوں کے متعلق اسلام کی ہدایت کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس ہدایت کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی بھی دین کے قبول کرنے اور اس کا اتباع کرنے میں کوئی جبر نہیں۔ جس کا جی چاہے اسلام قبول کرے اور جس کا جی چاہے قبول نہ کرے۔ جب اسلام غیر مسلموں کو کوئی بھی مذہب قبول کرنے کا حق دیتا ہے تو یہ واضح ہے کہ وہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق عبادت کا حق بھی دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اسلام اپنے پیرووں کو مثبت طور پر ہدایت کرتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کی مقدس ہستیوں کا احترام کریں اور انھیں برا بھلا نہ کہیں۔ اس لیے

۲؎ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ ج ۲۰۔

۳؎ ماہنامہ الدعوۃ، اپریل ۲۰۰۱ مضمون: اسلام، بت شکنی اور طالبان۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ اگر مسلمانوں نے ایسا کیا تو غیر مسلم ردِعمل میں مبتلا ہو کر اللہ اور اسلام کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔ غیر مسلم مقدس ہستیوں کے احترام میں ان کے اصنام اور مقدس مقامات سب کا احترام آپ سے آپ شامل ہے۔ سورہ انعام میں ارشادِ خداوندی ہے:

''(اے مسلمانو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں برا مت کہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بناء پر اللہ کو برا کہنے لگیں''۔ (الانعام ۶:۱۰۸)

صرف یہی نہیں بلکہ قرآن مجید ان تمام عبادت گاہوں کو بہت محترم سمجھتا ہے جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب کی ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ پروردگار غلط کار لوگوں کو اس دنیا میں بہت زیادہ زور پکڑنے نہیں دیتا، کیونکہ اگر دنیا میں ان غلط کاروں کا دور دورہ ہو جائے تو یہ تمام عبادت گاہوں کو مسمار کر ڈالیں گے۔ حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسجدوں کے علاوہ باقی تمام عبادت گاہوں میں پروردگار کی عبادت کے ساتھ شرک کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

''اگر اللہ (غلط کار) لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں، گرجا، یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں، جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں''۔ (الحج ۲۲:۴۰)

درج بالا بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام کے نزدیک تمام مذاہب کے مقدس مقامات اور مقدس ہستیاں قابلِ احترام ہیں۔

اس ہدایت کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ بیت اللہ اور اس کے اردگرد علاقے کی ایک خصوصی حیثیت ہے۔ وہ یہ کہ خانہ کعبہ کو پروردگار کے براہِ راست حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خالصتاً خدائے واحد کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ گویا اس کرۂ ارض پر یہ جگہ توحید کا مرکز ہے۔ چنانچہ یہ لازم ہے کہ اس پورے علاقے کو شرک کے ہر شائبے سے پاک رکھا جائے۔ اور اس کو خصوصی حیثیت دی جائے۔ مسجدِ حرام یعنی بیت اللہ کے اردگرد کے علاقے کو بھی شرک سے پاک رکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ حاجیوں کو سفر میں رکاوٹ پیش نہ آئے، انھیں فراواں رزق ملتا رہے۔ اور وہاں ایک ایسی حکومت ہو جس کا اصل کام بیت اللہ کی حفاظت و انتظام ہو۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے پروردگار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں فتح کیا۔ اس میں جزیرے نمائے عرب کا بیشتر حصہ شامل ہے۔ چونکہ یہ جگہ توحید کا مرکز ہے، اس لیے اس میں کسی معبود و بت کی اجازت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نے اس پورے علاقے کو شرک کے ہر شائبے سے پوری طرح پاک کر دیا اس ہدایت کے مختلف پہلو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان ہوئے ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب کا وہ حصہ جسے پروردگار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا، وہاں سے قرآن مجید کی درج بالا ہدایات کے اتباع میں آپ نے ہر معبد، ہر بت، ہر پُر تعظیم تصویر اور ہر ابھری ہوئی قبر کو ختم کر دیا۔ صحیح روایات میں یہ سب نہایت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم پر اس ہدایت کے دونوں حصے اتنے واضح تھے کہ جونہی ان کے قدم اِس خصوصی سرزمین یعنی

جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکلے تو خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر معبد، راہب اور عابد کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ سرزمینِ عرب سے باہر فتوحات کے وقت، صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم کے دور میں کسی عبادت گاہ کو نہیں چھیڑا گیا۔ دوسرے مذاہب کے کسی مقدس مقام کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ حتیٰ کہ نمایاں مقامات پر واقع بہت بڑے اصنام مثلاً ابوالہول اور ابوسنبل کی بھی پوری حفاظت کی گئی۔ واضح رہے کہ سرزمینِ مصر کے یہ علاقے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وقت میں فتح ہوئے تھے۔

درج بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں علاقوں میں غیر مسلموں کے تمام مقدس مقامات اور عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا اور ان کا پورا احترام کرنا لازم ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ایک خصوصی سوال کی طرف توجہ کی جائے جو ہمارے درج بالا موقف کے حوالے سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو کیوں توڑا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ انبیاء کی آیات ۵۱ تا ۷۱ اور صٰفّٰت کی آیات ۸۳ تا ۱۰۹ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں اپنی قوم کو ان کے عقیدے کی غلطی اور ان بتوں کی کم مائیگی و بے چارگی پر متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ اپنی قوم کے لوگوں کو متوجہ کرنے اور ان کو ان کے افکار کے کھوکھلے پن سے آگاہ کرنے کے لیے پروردگار نے ان کو ایک خاص اسلوب عطا کیا تھا۔ مثلاً جب انھوں نے اپنی قوم کو سورج، چاند اور ستاروں کی عبادت کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کی، تب بھی انھوں نے ایک منفرد طریقہ اختیار کیا۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت کو بھی قرآن مجید نے موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ بتوں کے خلاف ان کے اقدام کے پیچھے یہ بات کارفرما نہیں تھی کہ بتوں کو توڑنا کارِ نبوت کا ایک حصہ ہے، اس لیے انھوں نے بت توڑے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے بڑے بت کو نہ چھوڑتے۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام انبیا یہ کام کرتے اور اگر ایسا کرنا لازم ہوتا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکی دور میں بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے بتوں کو توڑتے۔ جبکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مکی دور کے تیرہ سالوں میں آپ نے بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے سیکڑوں بتوں میں سے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس موضوع پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے ان میں تین باتیں اس قابل ہیں کہ ان پر تبصرہ کیا جائے۔ ان میں سے ایک بات مولانا زاہد الراشدی نے اپنے ایک مضمون میں یہ کہی ہے کہ حضور کے دور میں صرف ان بتوں کو توڑا گیا جو نمایاں مقامات پر نصب تھے۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ طالبان نے بھی عبادت گاہوں کے بجائے نمایاں مقام پر ایستادہ بتوں کو مسمار کر کے صحیح کام کیا ہے۔ مولانا راشدی یہ بات صحیح نہیں ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ضمن میں انھوں نے تفسیر ابنِ کثیر (اردو کی) جلد پنجم کے صفحات ۲۴۷ اور ۲۴۸ کا حوالہ دیا ہے۔ وہی حوالہ یہ ثابت کر رہا ہے کہ حضور نے جزیرہ نمائے عرب میں واقع تمام معابد، بتوں اور ہر اس چیز کو مٹا دیا تھا جس میں شرک کا کوئی ہلکے سے ہلکا شائبہ بھی موجود تھا۔ درج بالا حوالے کے

چند فقرے یہ ہیں:

''یہ لوگ اپنے اپنے معبودانِ باطل کے پرستش کدے بناتے تھے۔ لات ایک منقش سفید پتھر تھا جس پر گنبد بنا رکھا تھا۔ غلاف چڑھائے جاتے تھے، مجاور، محافظ اور جاروب کش مقرر تھے۔ اس کے آس پاس کی جگہ کو مثلِ حرم کے حرمت و بزرگی جانتے تھے۔ یہ اہلِ طائف کا بت کدہ تھا...... اسی طرح ان تین کے علاوہ اور بھی بہت سے بت اور تھان (تھان کے معنی ہیں عبادت والا مقام یعنی معبد) تھے جن کی عرب لوگ پرستش کرتے تھے...... ان مقامات کا یہ لوگ طواف بھی کرتے تھے...... ذوالخلصہ نامی بت خانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے فنا ہوا...... فلس نامی بت خانہ کے توڑنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ مامور تھے...... اہل یمن کے بت خانے کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی...... رضا نامی بت کدہ بھی ڈھا دیا گیا...... ذوالکعبات نامی صنم خانہ...... سنداد (ایک جگہ کا نام) میں تھا۔''

درجِ بالا حوالہ تو یہ ثابت کر رہا ہے کہ حضور کے حکم سے سرزمینِ عرب کی تمام معابد، صنم خانے اور بت کدے ڈھا دیے گئے۔ نمایاں اور غیر نمایاں مقامات، یا چار دیواری اور بغیر چار دیواری والی کی جگہوں کی تفریق اس میں کہیں بھی نہیں۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ عہد فاروقی میں مصر میں غیر مسلموں کی عبادت گاہیں اس وجہ سے مسمار نہیں کی گئیں کہ ان سے اس ضمن میں معاہدہ کیا گیا تھا۔ گویا اگر معاہدہ نہ کیا جاتا تو یہ تمام عبادت گاہیں مسمار کر ڈالی جاتیں۔ یہ دلیل دو وجود کی بناء پر غلط ہے۔ پہلی وجہ ہے کہ اس معاہدے سے بہت پہلے حضرت ابوبکر نے ریاستی پالیسی کے طور پر یہ حکم جاری کیا تھا کہ غیر مسلموں کی کسی بھی عبادت گاہ کو نہ چھیڑا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان، غیر مسلموں سے کبھی کوئی ایسا معاہدہ کر ہی نہیں سکتے تھے جو توحید کے خلاف ہو اور جو قرآن مجید یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی خلاف ورزی پر مبنی ہو۔ اگر غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو مٹانا اسلام کا حکم ہوتا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ حضرت عمر اس کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے غیر مسلموں سے اس کے برعکس معاہدہ کرتے۔ حضرت عمر نے اہلِ مصر سے جو معاہدہ کیا، وہ یقیناً اسلام کی اتباع اور حضرت ابوبکر کے حکم کی روشنی میں تھا۔ اور وہ معاہدہ اس اصول پر مبنی تھا کہ سرزمینِ عرب سے باہر غیر مسلموں کے کسی بھی معبد یا مقدس مقام کی بے حرمتی مسلمانوں کے لیے ممنوع ہے۔

تیسری بات یہ کہی گئی کہ ابوالہول اور اس طرح کے دوسرے عظیم بتوں کو دورِ فاروقی میں اس وجہ سے منہدم نہیں کیا گیا تھا کہ یہ صرف ایک مجسمہ نہیں تھا، بلکہ اس طرح ایک انسان کو سزا دی گئی کہ شیر کے دھڑ میں اس کے جسم کو چنوا کر اسے قابلِ عبرت بنا دیا گیا تھا۔[۴] درج بالا بیان صحیح نہیں ہے۔ ابوالہول (SPHINX) اور ابوسنبل وغیرہ عظیم الجثہ بتوں کے متعلق کسی بھی انسائیکلوپیڈیا میں پوری تفصیل معلوم کی جا سکتی ہے۔ ابوالہول کا مجسمہ ہورس نامی خدا کا نمائندہ تھا۔ (درحقیقت ''الدعوۃ'' کے

---

۴ لشکر طیبہ کا ترجمان ''الدعوۃ'' اپریل ۲۰۰۱، ص ۱۱۔

۵ مثلاً کولیئرز انسائیکلو پیڈیا ج ۱ ص ۴۲ اور ج ۲۱ ص ۴۳۸۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

مضمون نگار نے یونانی دیو مالا اسفنکس کو ابوالہول کے ساتھ خلط ملط کر دیا جس سے ان کو غلط فہمی لاحق ہو گئی) ان تمام مجسموں کی عبادت کی جاتی تھی اور ان کو کسی نہ کسی خدا یا خدائی طاقت کا اظہار سمجھا جاتا تھا۔

چوتھی بات محمود غزنوی کے اقدام سے متعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمود غزنوی کے کسی اقدام کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہوتی۔ سومنات کا بت ایک مندر کے اندر تھا۔ اس لیے اس سے طالبان کے اقدام کو کوئی تائید بھی نہیں ملتی۔ مزید یہ کہ محمود نے اس ایک بت کے علاوہ اور کوئی بت نہیں توڑا۔ خود اس کے دارالحکومت غزنی میں ہندوؤں کے محلے آباد تھے اور وہاں مندر موجود تھے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ بدھ کے مجسموں کو توڑنا درحقیقت ان زیادتیوں کا بدلہ ہے جو آج کے غیر مسلم ممالک مسلمانوں پر روا رکھ رہے ہیں۔ یہ اپنی جگہ پر ایک تفصیلی موضوع ہے کہ مسلمانوں کی آج کی زبوں حالی کی اصلی وجوہ کیا ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر کسی دوسرے موقع پر تفصیل سے لکھا جائے گا۔ مختصراً اتنا کہنا مناسب ہے کہ راقم الحروف کے خیال میں مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اسباب نوے فی صد اندرونی ہیں۔ تاہم اس سوال کا جواب قرآن مجید نے نہایت واضح طور پر دے دیا ہے کہ دوسروں کے غلط کام کے جواب میں مسلمان کبھی بھی خلافِ عدل کام نہیں کر سکتے۔ اس سے صرف ایک صورت مستثنیٰ ہے۔ وہ یہ کھلی مسلح جنگ کے موقع پر اگر دشمن کوئی زیادتی کرے اور غلط ہتھکنڈوں سے کام لے تو اس کے مقابلے میں مسلمان بھی ویسی ہی جوابی کاروائی کر سکتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اے ایمان والو، عدل پر قائم رہنے والے بنو۔ اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس طرح نہ ابھارے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔'' (المائدہ ۵:۸)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اختر حسین عزمی

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی

''میں نے خدا کا نام لے کر ''خدام الدین'' کی جماعت قائم کر دی ہے۔ الگ مکان لے دیا ہے اور الگ تربیت ہے۔ قریباً ایک مہینا ہوا ہے، اب تک امید افزا آثار ہیں۔ احکامِ اسلامی کی پابندی میں شغف اور مستعدی پائی جاتی ہے۔ ابھی سات لڑکے عہد و پیمان کے ساتھ خود اپنی مرضی سے داخل ہوئے ہیں۔ یہ دیہات وغیرہ میں اشاعتِ اسلام کے کام بھی آئیں گے[1]۔''

یہ الفاظ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے اپنے قریبی عزیز مولانا حمید الدین فراہی کو اپنے ایک مکتوب میں لکھے۔ سید سلیمان ندوی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ان سات خادمانِ دین میں ایک یہ مرحوم عبد الرحمٰن نگرامی تھے۔ یہ جماعت بٹ گئی۔ اس کا بانی رخصت ہو گیا۔ حالات بدل گئے۔ مگر عبدالرحمٰن نے اس حیثیت سے جو عہد کیا تھا، اس کو اخیر تک نبھایا۔''

(سید سلیمان ندوی ''یادِ رفتگان''، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی ۱۹۸۳، ص: ۶۱)

مولانا شبلی کی نظر میں اس بچے کی کیا قدر و منزلت تھی اس بارے میں سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم جو اچھی استعداد اور قابلِ جوہر کے ہمیشہ جویا رہتے تھے، وہ خاص طور پر مرحوم عبد الرحمٰن نگرامی کی تربیت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک دو دفعہ جلسوں میں وہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔ مدرسہ سرائے میر (اعظم گڑھ) کے پہلے یا دوسرے اجلاس میں مولانا جب ان کو ساتھ لائے تو بچے کی زبان سے اچھے خیالات اور ایسی سنجیدہ تقریر سن کر لوگ حیرت میں آ گئے۔'' (سید سلیمان ندوی، یادِ رفتگان، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی ۱۹۸۳، ص: ۶۰۔۶۱)

ولادت و تعلیم

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ۱۸۹۹ء میں ضلع لکھنو کے مردم خیز قصبے نگرام کے ایک معروف صاحبِ علم انصاری خاندان میں پیدا

---

[1] مکاتیبِ شبلی، شبلی نعمانی، ص ۳۶، حصہ دوم معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۲۷ء۔

ہوئے۔ ابھی کمسن تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پرورش ان کے شفیق چچا مولانا محفوظ الرحمٰن نے کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے۔ یہیں انھوں نے قرآنِ مجید حفظ کیا اور ابتدائی درسیات پڑھیں[2]۔

۱۹۰۷ء میں وہ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنو میں داخل ہوئے۔ اس وقت مولانا سید سلیمان ندوی مدرسہ میں ادبیات کے استاد تھے۔ انھوں نے عبدالرحمٰن کو ابتدائی کتب پڑھائیں[3]۔

۱۹۰۸ء میں آریہ سماج نے شدھی کا پہلا فتنہ اٹھایا۔ آریہ سماجی مبلغوں کے جوشِ تبلیغ سے ناخواندہ مسلمان متاثر ہو رہے تھے۔ آریہ سماج کی ان سرگرمیوں نے مسلمان اہلِ نظر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور شدھی کے مقابلے میں مختلف تبلیغی انجمنیں میدانِ عمل میں آ گئیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے ان متفرق اور پراگندہ تبلیغی کوششوں کو مربوط و یکجا کرنے کی خاطر ۶، ۷، ۸ اپریل ۱۹۱۲ کو لکھنو میں ایک اجلاس بلایا اور ندوۃ العلما میں مبلغین تیار کرنے کے لیے ''خدام القرآن'' کی ایک جماعت قائم کی[4]۔ اس جماعت میں صرف ان طلبہ کو داخل کیا جاتا تھا جن کے والدین یا اولیا اپنے بچے کو صرف خدمتِ دین کے لیے وقف کر سکیں۔ یہ بچے سادہ پہننے، سادہ کھانے، اور سادہ رہنے کا عہد کرتے تھے[5]۔ مولانا نگرامی بھی اس جماعت سے وابستہ ہو گئے۔

تدریس و سیاست

۱۹۱۵ء میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد چار برس تک مدرسہ سرائے میر میں رہ کر درس و تدریس کا فرض انجام دیا، اس دوران میں سید سلیمان ندوی کے بقول:

> ''مدرسہ میں زیر تربیت چند اچھے لڑکے پیدا کیے، جن میں سے ایک آج مولانا امین احسن اصلاحی کے نام سے مشہور ہیں، اسی زمانہ میں انھوں نے مولانا حمید الدین کے زیرِ سایہ قرآنِ پاک کا فیض حاصل کیا۔''
>
> (سید سلیمان ندوی ''یادِ رفتگان''، مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی ۱۹۸۳، ص: ۶۱)

تحریکِ ترکِ موالات کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد کلکتہ قائم کیا۔ ان کی خواہش پر مدرسہ اسلامیہ کلکتہ کی صدر مدرسی کا عہدہ قبول کیا اور انتہائی کسمپرسی کے عالم میں نہایت جفاکشی سے اسے چلایا[6]۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مولانا نگرامی کے کلکتہ جانے کی ایک دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[2] مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، پروفیسر اختر راہی۔ ص ۴۵۔ ماہنامہ ''المعارف'' لاہور اگست ۱۹۸۱۔

[3] یادِ رفتگان، سید سلیمان ندوی، ص ۶۰۔

[4] مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، پروفیسر اختر راہی۔ ص ۴۶۔ ماہنامہ ''المعارف'' لاہور اگست ۱۹۸۱۔

[5] یادِ رفتگان، سید سلیمان ندوی، ص ۶۱۔

[6] یادِ رفتگان، سید سلیمان ندوی، ص ۶۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''اسی اثنا میں ملک میں خلافت وترکِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ مدرسے پر مدرسے بند ہونے لگے۔ نئے نئے پرچے اوراخبار جاری ہونے لگے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۲۰ء میں ایک اخبار ''پیام'' کے نام سے نکالنا چاہا اوراس کے لیے نگرامی مرحوم کو اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے۔نگرامی اس کے لیے بہت موزوں ثابت ہوئے۔''[7]

اسی زمانہ میں کلکتہ شہر کی خلافت کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے اور سارے شہر کو اخلاق وایثار سے اپنا گرویدہ بنالیا۔[8] اس زمانے میں اعظم گڑھ اور کلکتہ میں ان کی سیاسی تقریریں حددرجہ بلا انگیز ہوتی تھیں،مگران کا دل کبھی خوف سے آشنا نہ ہوا۔[9] اس تحریک کے دوران میں قید وبند کی صعوبت بھی برداشت کی۔[10]

مدرسہ اسلامیہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔سید سلیمان ندوی کے اصرار پر کلکتہ سے لکھنو آئے اور ۱۹۲۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں ادب وتفسیر کی خدمت ان کے سپرد کر دی گئی، جسے انھوں نے آخر دم تک نبھایا۔[11]

صحافت

ندوہ کی تدریسی زندگی کے دوران میں انھوں نے صحافت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔مولانا عبدالماجد دریاآبادی لکھتے ہیں:

''اخیر ۱۹۲۴ء میں ظفرالملک علوی کاکوروی، مالک ''الناظر'' پریس کے مشورے سے یہ طے پایا کہ لکھنو سے ایک ہفتہ وار اصلاحی پرچہ،نیم سیاسی،نیم مذہبی،''سچ'' کے نام سے سلیس زبان میں عام فہم انداز سے نکالا جائے۔پرچہ شروع ۱۹۲۵ء سے جاری ہوا۔اس کے ایڈیٹر تین قرار پائے۔ایک خود ظفرالملک دوسرے میں،تیسرے یہی مولانا عبدالرحمٰن نگرامی۔مضمون ہم تینوں لکھتے۔مذہبی عنوانات پر زیادہ تر نگرامی مرحوم ہی قلم اٹھاتے اور لکھنے کا حق ادا کر دیتے۔''[12]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''حسنِ ترتیب،حسنِ بیان،سلاستِ زبان،ذوقِ انشاء کی شہادت ان کے قلم کی نکلی ہوئی ہر سطر دے رہی ہے۔''

(وفیاتِ ماجدی،لکھنو ۱۹۷۸،ص ۶۲-۶۳)

(جاری)

---

۷ معاصرین،عبدالماجد دریاآبادی،ص ۲۲۴۔مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۸ یادِرفتگان،سید سلیمان ندوی،ص ۶۲۔

۹ یادِرفتگان،سید سلیمان ندوی،ص ۶۵۔

۱۰ معاصرین،عبدالماجد دریاآبادی،ص ۲۲۴۔مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی۔

۱۱ یادِرفتگان،سید سلیمان ندوی،ص ۶۲۔

۱۲ معاصرین،عبدالماجد دریاآبادی،ص ۲۲۵۔مجلسِ نشریاتِ اسلام کراچی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

دانش سرا، پاکستان کا تیسرا سالانہ کنونشن

دانش سرا، پاکستان کا تیسرا سالانہ کنونشن ۲۳، ۲۴، ۲۵ مارچ ۲۰۰۱ کو رباط العلوم الاسلامیہ عالم گیر روڈ بہادر آباد کراچی میں منعقد ہوا۔ مدیرِ ''اشراق'' اور دانش سرا، پاکستان کے بانی جناب جاوید احمد غامدی نے اس کنونشن کے پہلے روز افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا:

خواتین وحضرات، میں نے جب سے شعور سنبھالا ہے اور میرا دینی علوم سے تعلق قائم ہوا ہے، اس وقت سے دو چیزیں میری خصوصی دلچسپی کا موضوع رہی ہیں۔ ایک یہ چیز کہ دین کو اس کے اصل ماخذوں سے سمجھنے کی روایت زندہ کی جائے۔ میں نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی، جو ماحول اپنے گردوپیش میں دیکھا، اس میں یہ روایت بڑی حد تک مردہ ہو چکی تھی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس روایت کو زندہ کیے بغیر، کم سے کم دورِ حاضر میں نہ مسلمانوں کی نئی نسل کو دین پر مطمئن کیا جا سکتا ہے اور نہ مغربی تہذیب کے اس استیلا اور تغلب میں اسلام کی دعوت دوسرے لوگوں کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ دین کے لیے وہ کام جو ہماری قوم میں ہو رہے ہیں یا ان سے آگے بڑھ کر ہماری ملت میں ہو رہے ہیں، ان کا جائزہ لے کر یہ دیکھا جائے کہ ان کی جہت کس طرح سے درست کی جا سکتی ہے۔

پہلے مسئلے کی راہ میں ایک ہفت خوان حائل تھا اور میں اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ کم وبیش ربع صدی کے عرصے میں مجھے مدرسۂ فراہی کے جلیل القدر علما سے استفادے کا موقع ملا، اس سے میرے لیے یہ راہ کھل گئی۔ اس معاملے میں، میں جس حد تک کچھ حقیر خدمات انجام دے سکا، لوگ ان کا جائزہ لیتے رہیں گے اور ان کی قدروقیمت کا تعین بھی کرتے رہیں گے۔ میں اتنی بات بہرحال کہہ سکتا ہوں کہ ان خدمات سے کچھ اور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن یہ اطمینان ضرور ہوا ہے کہ کسی حد تک اس روایت کا احیا ہو گیا ہے اور کسی حد تک یہ واضح ہو گیا ہے کہ کہ دین کو اس کے اصل ماخذوں یعنی قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بنیاد پر اگر سمجھا جائے تو اس سے کیا روشنی حاصل ہوتی ہے؟ کون سے مسائل حل ہوتے ہیں؟ کون سے افق نمایاں ہوتے ہیں اور جادہ ومنزل میں کیا تغیرات آتے ہیں؟

دوسری چیز کے لیے میں نے یہ کوشش کی کہ امت میں جو کچھ علمی کام ہو رہا ہے اس کا دقتِ نظر کے ساتھ جائزہ لیا جائے،

اس کے اندر اتر کر دیکھا جائے کہ معاملے کی نوعیت فی الواقع کیا ہے۔ اس میں جو کچھ خیر ہے، اسے ہر حال میں دانتوں سے پکڑ لیا جائے اور جہاں کہیں خرابی اور کوتاہی ہے، اس کی اپنی دانش کے مطابق، اپنے حقیر علم کی حد تک اصلاح کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ سارا سفر علم و عمل دونوں اعتبارات سے بڑے مراحل سے گزرا ہے۔ اس میں ترک و اختیار کی بے شمار منازل آئی ہیں۔ اس میں بہت سے حقائق کو واضح ہونے میں بہت سا وقت لگا ہے۔ اور بے شمار مسائل ہیں جن کے بارے میں ایک رائے بنی ہے اور ایک رائے تبدیل ہوئی ہے۔ تراشیدم، پرستیدم، شکستیدم کے بڑے مراحل سے گزرے، تب کہیں جا کر وہ اطمینان حاصل ہوا ہے جس کی بنیاد پر کسی کام کی بنا ڈالی جا سکے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اب جو کچھ واضح ہے، اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی؛ جو راستہ متعین ہو گیا ہے، اس میں کوئی موڑ نہیں آئے گا؛ جس منزل کو آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ کسی درجے میں اوجھل نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحی و الہام کا دروازہ بند ہو چکا ہے، نبوت ختم ہو گئی ہے، ہم سب انسان ہیں، ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب کی رہنمائی ہے، اس کے پیغمبر کی رہنمائی ہے، لیکن ہم اپنے علم اور اپنی عقل کی حد تک ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہماری بات غلط بھی ہوتی ہے، صحیح بھی ہوتی ہے۔ اس کی غلطی کو کوئی آنے والا واضح کر دیتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا اصل بات کچھ اور تھی جس کو ہم دیکھ نہ سکے۔ اور اگر آنے والا وقت اس کی تصدیق کر دیتا ہے تو اطمینان ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے حقیر علم کی حد تک جو کچھ سمجھا، اس نے کوئی راستہ واضح کر دیا۔

لہٰذا ہم انسانوں کو آرا قائم کرنی ہیں، دین کے حقائق پر غور کرنا ہے، زندگی کے مختلف معاملات کے بارے میں کوئی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہے اور پھر اپنے علم کی حد تک اس کے مطابق عمل کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔ پیشِ نظر یہ ہے کہ یہ غور کرنے کی روایت زندہ کر دی جائے۔ ہم ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی غلطیوں پر شایستگی اور تہذیب کے ساتھ متنبہ کریں اور آگے بڑھتے ہوئے اور پیچھے دیکھتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن رہیں۔

یہ چیز ہمیشہ میرے سامنے رہتی ہے۔ میں نے اپنے رفقا، اپنے احباب اور اپنے طلبہ کو بھی ہمیشہ اس کی نصیحت کی ہے اور اسی چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے کہ اس امت میں یہ روایت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ جو کچھ کر چکی ہے، اس پر بھی غور کرے، جو کچھ آیندہ کرنا ہے اس کو وحی و الہام سمجھ کر آگے نہ بڑھائے، بلکہ یہ دیکھے کہ کیا چیز لینے کی ہے اور کیا چھوڑ دینے کی ہے، کیا ترک کرنے کی ہے اور کیا اختیار کر لینے کی ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے، جس میں، میں نے یہ ارادہ کیا کہ پہلا کام تو یہ کیا جائے کہ دین کے ماخذ کی بنیاد پر جو کچھ دین سمجھ میں آتا ہے، جو کچھ اس کے حقائق واضح ہوتے ہیں، ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ میرے سامنے یہ چیز اولین ترجیح کے طور پر رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک لمبے عرصے تک اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جن حقائق کو میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، ان میں بھی ترک و اختیار کے بے شمار مراحل درپیش تھے۔ چنانچہ پھر ایک وقت ایسا آ گیا جب اس مقصد کے لیے میں نے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے میں اب میں کوشش کر رہا ہوں کہ جو کچھ دین ہم سمجھتے ہیں، اسے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے، جو اہلِ علم اس طریقے پر دین سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس مدرسۂ فکر سے وابستہ ہیں، ان کی مزید تربیت کا انتظام کیا جائے۔ جو حقائق واضح ہو رہے ہیں، ان کو مرتب کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ دورِ جدید میں جو ذرائع پیدا ہو گئے ہیں، ان سب کو استعمال کر کے یہ کوشش کی جائے کہ یہ بات دوسرے لوگوں تک پہنچے، بحث ومباحثے کا موضوع بنے، اس پر تبصرہ ہو اور پھر اس کے غث وثمین کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لینے کے مواقع پیدا کیے جا سکیں۔ یہ ادارہ ''دارالاشراق'' ہے۔ میری کوشش ہے کہ میں اس کی تنظیم اس طریقے سے کر دوں کہ جس میں کم سے کم نشر واشاعت اور دعوت کے معاملات باقاعدہ تسلسل اختیار کر سکیں۔ چنانچہ اسی ادارے کے اہتمام میں ہمارے دو رسائل نکل رہے ہیں۔ ایک ''اشراق'' ہے اور دوسرا ''رینی ساں''۔ ایک اردو میں ہے اور دوسرا انگریزی میں۔ اسی کے تحت ہماری ویب سائٹس قائم ہیں، جن میں دنیا بھر سے آنے والے استفسارات کے جوابات دیے جا رہے ہیں اور میں اظہارِ تشکر کے طور پر یہ بات بیان کر رہا ہوں کہ ان دونوں ویب سائٹس کو اس وقت عالمی سطح پر سب سے زیادہ مقبول ویب سائٹس ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

لوگوں نے جس طرح دین کی طرف رجوع کیا ہے اور یہ امرِ واقعی ہے کہ دنیا بھر سے رجوع کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے ذہنوں میں دین کے بارے میں جو مسائل ہیں، ان کا انھیں حل ملا ہے۔ مختلف چیزوں کے بارے میں جو اشکالات وہ محسوس کر رہے تھے، وہ دور ہوئے ہیں۔ جو مباحث غیر مسلموں نے اٹھا دیے تھے، ان کے بارے میں ان کے ذہن درست ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو اس وقت جو مسائل درپیش ہیں، ان میں بھی کچھ ان کی رہنمائی ہوئی ہے اور دین و شریعت کی وہ حقیقتیں جو نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھیں، وہ نمایاں ہوئی ہیں۔ ہماری کتابیں اور تصنیفات سب اس ادارے کے تحت شائع ہو رہی ہیں اور ان شاء اللہ مستقبل میں مزید شائع ہوتی رہیں گی۔ وہ لوگ جنھوں نے مجھ سے کچھ تربیت پائی ہے اور اب اس مدرسۂ فکر میں کچھ علمی خدمات انجام دے سکتے ہیں، میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ ان کو بھی اس ادارے کے تحت منظّم کر دوں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دوسری چیز بیان کرنے سے قبل یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ایک عام آدمی دین سنتا ہے، سمجھتا ہے، اس پر غور کرتا ہے اور جو کچھ اس کو صحیح معلوم ہوتا ہے، اس کو اپنا لیتا ہے، لیکن وہ سنتا کن لوگوں سے ہے؟ انھی لوگوں سے سنتا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ دین میں اختصاص کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی دین کا محقق بن کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر ڈالی بھی نہیں ہے۔ دنیا کا نظم جس اصول پر چل رہا ہے اس میں مختلف لوگ مختلف ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی صحت کے معاملات کو دیکھتا ہے، کوئی ان کی تربیت کے معاملات کو دیکھتا ہے، کوئی ان کی تعلیم کے معاملات کو دیکھتا ہے، کوئی ان کی تعمیر کے کاموں کو دیکھتا ہے، غرض یہ کہ مختلف نوعیت کے کام ہیں جو مختلف لوگ انجام دیتے ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو مختلف صلاحیت دے رکھی ہے اور اس اصول پر دے رکھی ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ لوگوں نے منڈی میں بھی بیٹھنا ہوتا ہے، دفاتر میں بھی جانا ہوتا ہے، حکومت کا نظم ونسق بھی چلانا ہوتا ہے، اداروں کو تشکیل بھی دینا

ہوتا ہے،غرض یہ کہ زندگی کے متعلق جتنے بھی شعبے ہیں،ان سب میں کچھ نہ کچھ خدمات انجام دینا ہوتی ہیں۔ یہ چیز ہر آدمی کے بس میں نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو دین کے علم ہی کے لیے خاص کر لے۔ ہر مسلمان یہ تو کرتا ہے کہ جتنا دین اس کی ضرورت ہے،اسے وہ سمجھ لے،اس کے مقاصد اس پر واضح ہو جائیں۔لیکن وہ محقق بن جائے، وہ جید عالم بن جائے، یہ چیز ہر آدمی کے بس کی نہیں ہوتی،مگر دین کی دعوت اسی وقت دوسروں تک پہنچائی جاسکتی ہے جب دین کو جاننے والے، دین کی حقیقتوں کو سمجھنے والے اور دین کے ماخذوں سے براہِ راست تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد امت کے اندر پیدا ہو جائے۔

میرے سامنے دوسرا کام یہ تھا کہ جس طریقے سے ہم نے دین سیکھا، جس طرح ہم پر دین کی حقیقتیں واضح ہوئیں اور جس طرح اس کے علوم سے ہمارا تعلق پیدا ہوا ہے، اسی نقطۂ نظر کے مطابق، انھی اصولوں پر اب اہلِ علم پیدا کرنے کے لیے کوئی ادارہ وجود میں لانا چاہیے۔ چنانچہ آج سے دس سال پہلے میں نے اس مقصد کے لیے معہد العلم الاسلامی، ''المورد'' کی تاسیس کی۔اس کا ایک بنیادی مقصد یہ طے کیا کہ جو لوگ دین کے جید عالم بننا چاہتے ہیں، جن کے سامنے یہ مقصد ہے کہ وہ دینی علوم میں اختصاص کو اپنا اصل کام بنا لیں، ان کی تربیت اور تعلیم کا اعلیٰ ترین درجے پر اہتمام کیا جائے۔ ہمارے معاشرے میں، جس میں ہم جی رہے ہیں اور جس میں دین کے ماخذ کے ساتھ براہِ راست تعلق کی روایت بہت حد تک مردہ ہو چکی ہے، یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا۔اس طرح کے کسی ادارے کے لیے ایسے لوگوں کا جو پہلے سے دینی علوم سے واقف ہیں یا دینی علوم سے وابستہ ہیں، تعاون حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ نئی نسل کے کچھ نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے کہ وہ وہاں تدریس کی ذمہ داریاں انجام دینے کے قابل ہو سکیں۔اس میں بھی ظاہر بات ہے کہ وسائل اور حالات کے لحاظ سے جس درجے کے لوگ بھی میسر ہوئے، انھی کو لے کر یہ کام کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایسے افراد تیار ہو گئے جو اس نوعیت کے کسی ادارے کی بنا ڈالنے کے لیے کافی صلاحیتوں کے حامل بھی تھے اور ایک حد تک انھوں نے ہمارے فکر اور طرزِ فکر کو سمجھ بھی لیا تھا۔ چنانچہ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ادارہ جو معہد العلم الاسلامی، المورد کے نام سے لاہور میں قائم ہے، اس میں ہم اسلامی علوم میں اب ماسٹرز کی کلاسز لے رہے ہیں اور اس کو ہم نے عام دینی مدارس کے اصولوں پر قائم کرنے کے بجائے جدید درس گاہ کے اصولوں پر قائم کیا ہے۔ وہ لوگ جو بی اے اور بی ایس سی تک تعلیم حاصل کر چکے ہوں، وہ یہاں آئیں اور آ کر عربی زبان سیکھیں، اسلامی علوم سیکھیں اور پھر وہی ڈگری ان کو حاصل ہو جائے جو اس وقت ہماری یونیورسٹیاں معارفِ اسلامی میں ماسٹر کی ڈگری کے طور پر دیتی ہیں۔ میں یہ بھی آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی سال یہ کامیابی عطا فرمائی کہ اب کراچی ہی کی ایک یونیورسٹی کے ساتھ اس ادارے کا الحاق ہو جائے گا اور اس طرح جو لوگ ''المورد'' میں تعلیم پائیں گے، ان کو جو ڈگری ادارے کی طرف سے ملے گی، وہ اسی طرح ایک مسلمہ ڈگری ہو گی جس طرح پنجاب یونیورسٹی یا کسی اور ادارے کی ہوتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس وقت ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس میں اس تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف علوم کے ایسے کورسز کا بھی اجرا کیا جائے جن میں لوگ ڈپلومہ حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ابتدا ہے۔ اس میں ابھی بہت سی مشکلات اور بہت سے مسائل ہیں۔ نصاب کو بھی ابھی بہت سے مراحل سے گزرنا ہے۔ اساتذہ کو بھی ابھی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے بڑی تربیت پانی ہے۔ اور جس پیمانے پر لوگوں کے سامنے اس کا تعارف ہونا چاہیے تھا، وہ بھی چونکہ وسائل کی کمی کی وجہ سے نہیں کرایا جا سکتا، اس لیے طلبہ بھی اس درجے کے میسر نہیں ہو سکتے جس درجے کی ہم توقع کرتے ہیں۔

تیسری چیز دین وملت کی خدمت کے باب میں جو میرے سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ ایسا نظم قائم کیا جائے کہ جس میں قدیم خانقاہی نظام کی اصلاح کر کے تربیت کا ایک ادارہ وجود میں لایا جائے۔ وہ لوگ جو دین میں فکری لحاظ سے صحت حاصل کر لیتے ہیں، جن چیزوں کو انھوں نے سمجھنا ہوتا ہے، انھیں سمجھ لیتے ہیں۔ ایک حد تک دین کے ماخذ کے ساتھ ان کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے سامنے دین کی صحیح تعبیر آ گئی ہے، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ دین ان کے عمل کا حصہ بن جائے، دین ان کی روح کا حصہ بن جائے، اب اس کے مطابق ان کی تربیت ہو۔ جس معاشرے میں، جس ماحول میں وہ رہتے ہیں، اس میں جو مشکلات ان کو پیش آتی ہیں، وہ ان کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں۔ ان کے گردوپیش میں جو مصائب اور تکلیفیں ہیں، ان میں دین کی راہِ راست پر قائم رہنے کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو جائے اور دین انسان کی جو تعمیر کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے مطلوب چیزیں میسر ہو جائیں، وہ زندگی بسر کرتے ہوئے، اپنے کاروبار میں، اپنے تعلیمی کاموں میں، اپنے معاملات میں جو مشکلات محسوس کرتے ہیں، ان میں ان کی رہنمائی ہو جائے۔ اور وہ چیزیں جو دین میں اور دینی زندگی کے لیے سیکھنی ضروری ہیں، مگر معاشرے کی غلط تربیت کی وجہ سے وہ چیزیں سیکھ نہیں سکے، ان کے سکھانے کا اہتمام کر دیا جائے۔ غرض یہ کہ اعلیٰ علمی سطح کے کام کے بجائے عام آدمی کے لیے جو ایک خاص نوعیت کی تربیت درکار رہے، جس سے وہ اپنے آپ کو، اپنے نفس کو انضباط میں لے آتا ہے، اس کا اہتمام کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم لاہور میں ایک مسجد اور اس کے ساتھ ملحق ایک ادارے کی بنیاد رکھ چکے ہیں اور توقع ہے کہ اسی سال یہ بھی تعمیر کے مراحل سے گزرنے کے بعد اپنا کام شروع کر سکے گا۔

میں نے جس طرح عرض کیا ہے کہ اس میں مقصود یہی ہے کہ عام آدمی جب دین کو سمجھ لیتا ہے یا اس کا دین کی طرف رجحان ہو جاتا ہے یا اسے دین کے فکری معاملات میں یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے یا وہ چیزیں جو فکری لحاظ سے قبول کرنی چاہییں، وہ انھیں قبول کر لیتا ہے، جو چھوڑنے کی ہوں وہ انھیں چھوڑ دیتا ہے تو اس کی عملی تربیت کا اہتمام کرنے کے لیے کوئی ایسی تربیت گاہ قائم کی جائے، کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں وہ اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے۔ یہ اس کام کی شروعات ہیں، ابھی اس کام کی بنا ڈالی جا رہی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کو بھی اسی طرح بار آور کر دے جس طرح اس نے دوسرے کاموں کو کیا۔ اور میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں خانقاہوں کی پرانی روایت میں ''زاویہ'' کا لفظ بھی ایک زمانے تک

مستعمل رہا ہے اس کو بھی جدت کے ساتھ، نئی روح کے ساتھ، نئے مقاصد کے ساتھ اور دین اور خالص دین کی روشنی میں زندہ کیا جائے۔

چوتھی چیز جو دین وملت کے کاموں میں میرے سامنے آئی اور جو بہت توجہ کا تقاضا کر رہی تھی، وہ یہ تھی کہ یہ قوم جس کے ساتھ ہم رہتے بستے ہیں، اس کی تعمیر کا اہتمام کیا جائے۔ یہ چیز دو اعتبارات سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ اب دین جو کچھ بھی ہے اس میں شبہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے، اس میں شبہ نہیں کہ وہ انبیا کی قائم کردہ سنت میں ہے، اس میں شبہ نہیں کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ہے، یہ سب اپنی جگہ حقیقت ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس کو ہم اصل ماخذ کی بنیاد پر جب چاہیں، جس طرح چاہیں پیش کر سکتے ہیں، لیکن اب دین اپنے تعارف کے حوالے سے اس قوم کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔ یہ قوم جیسی بھی ہے، لوگ بہرحال اسے دیکھ کر دین کے بارے میں تاثر قائم کرتے ہیں۔ یعنی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمان دین کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اسے بیان بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ اسے پہنچا بھی رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر اقدام بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے علم سے اپنی زندگی بھی استوار کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے علم سے گریز کے راستے بھی تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ چلیں باہر کے لوگوں کو الگ رہنے دیجیے، خود مسلمانوں کی جو نئی نسلیں ہیں، ان تک اس طرح دین پہنچتا ہے، وہ اچھی یا بری رائے بھی اسی سے قائم کرتے ہیں۔ لہٰذا کوئی دین سے محبت رکھنے والا مسلمان اس قوم کے خیر وشر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اور میرا احساس یہ ہے کہ یہ خود دین کی نصرت کا تقاضا ہے کہ اس قوم کی تعمیر کا اہتمام کیا جائے۔ اس کام کو بھی ہدف بنایا جائے، دین مسلمان بھائیوں سے باہمی نصح وخیر خواہی کا تقاضا کرتا۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ دین ان چیزوں سے مجرد ہو کر کہیں بیان کیا جاتا رہے۔ اس کو سب سے پہلے اس امت میں پہنچنا ہے، اسے اس امت سے اعوان وانصار ملنے ہیں، اس امت سے وہ لوگ ملنے ہیں جو آگے بڑھ کر اس کا علم حاصل کر سکیں۔ لہٰذا نصرتِ دین اور نصح وخیر خواہی کا یہ تقاضا ہے کہ قومی تعمیر کو بھی موضوع بنایا جائے۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس طریقے پر سوچ رہے ہیں، ایسے ہی جذبات اپنے اندر رکھتے ہیں، اسی طرح قومی تعمیر کے جذبے سے سرشار ہیں، ایک ادارہ ان کے لیے بھی بنایا جائے۔ چنانچہ ''دانش سرا'' کو ہم نے ترک واختیار کے بہت سے مراحل سے گزرنے کے بعد اس کام کے لیے خاص کر دیا ہے۔ یعنی باقی تمام کاموں کو دوسرے اداروں میں منظّم کر لینے کے بعد یہ چیز دانش سرا کے ساتھ خاص کر دی ہے۔ پیشِ نظر رہے کہ دوسرے ادارے بھی اس کے پس منظر کے ادارے ہیں، وہ اس کے لیے معاون اداروں کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے فکر کی تشکیل انھی سے ہوئی ہے اور وہ اس کے دست و بازو ہیں۔ لیکن دین کی روشنی میں قومی تعمیر کا کام دانش سرا کے ساتھ خاص کر دیا ہے، تاکہ جو لوگ اس کام کا جذبہ رکھتے ہیں وہ اس ادارے کے تحت آ کر کام کریں۔

دانش سرا کے دینی محرکات تو میں نے واضح کر دیے، لیکن قومی تعمیر کے کام میں الم ناک صورتِ حال جو اس وقت درپیش ہے، ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کی جانب بھی اشارہ کر دوں۔ ہر مسلمان اس پر کڑھتا ہے کہ یہ امت اس وقت بحیثیتِ مجموعی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اضمحلال کا شکار ہے۔ یہ زوال آشنا ہو چکی ہے۔ اس کا کوئی وقار نہیں ہے۔ اس وقت دنیا میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ایک زمانہ اس پر اچھا بھی گزرا ہے۔ اس کا ماضی معمولی ماضی نہیں ہے۔ یہ دنیا کی تعمیر کر چکی ہے۔ دنیا کو علم و فن سے آشنا کر چکی ہے۔ دنیا کو ہدایت کی روشنی دے چکی ہے۔ دنیا پر اس کا سیاسی اور فکری غلبہ کم و بیش ایک ہزار سال تک قائم رہا۔ ایسے میں ہر شخص سوچتا ہے کہ زوالِ امت کے کیا اسباب ہیں؟ میرے نزدیک اس کے دو بنیادی اسباب ہیں: ایک اس کا قرآنِ مجید سے غیر متعلق ہونا۔ یعنی امت کے علم و عمل میں قرآن کو جس طرح محور کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے تھی، وہ بد قسمتی سے صدیوں سے اسے حاصل نہیں ہے۔ اور دوسرا سبب یہ کہ چوتھی صدی میں فلسفے اور تصوف کے ساتھ اس امت کے ذہین افراد کا اشتغال اور پھر ایک طویل عرصے تک اس اشتغال کا قائم رہنا۔

پہلی چیز کے اثرات امت پر یہ ہوئے کہ قرآن جس طریقے سے، جس روح کے ساتھ، جس استدلال کے ساتھ دین کو بیان کرتا ہے، امت اس سے محروم ہو گئی۔ اس کی فقہ قرآن کے تابع نہیں رہی، اس کا علمِ حدیث اس کے تابع نہیں رہا، اس کا علمِ کلام اس کے تابع نہیں رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت دین کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم نہیں رہی۔ قرآن جو ایک میزان ہے، ایک کسوٹی ہے، ایک فرقان ہے، اس کا یہ مقام امت میں باقی نہیں رہا۔ قرآن کو جو حیثیت امت کے علم، فکر، عمل میں ملنی چاہیے تھی، وہ نہیں ملی۔

دوسری چیز یعنی فلسفے اور تصوف سے اشتغال کے اثرات بھی انتہائی گہرے ہوئے۔ مابعد الطبیعیات کے حقائق کے بارے میں قرآنِ مجید کی جو نہایت واضح رہنمائی موجود تھی، ہم اس سے بہت دور ہو گئے۔ ہم نے ان چیزوں کو موضوع بنا لیا جن کے بارے میں ہمارے پروردگار کی ہدایت یہ تھی کہ: ''اس میں تمھیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔'' انھی موضوعات پر ہم دادِ تحقیق دیتے رہے۔ اس کے بعد لازمی نتیجے کے طور پر امت میں سائنسی فکر کا فقدان ہونا شروع ہو گیا۔ بنو امیہ کے بعد جب ہماری امت پر عجم کے اثرات ہوئے تو اس کے بعد لوگوں کے اصل اشتغال کا موضوع سائنسی فکر نہیں بنا۔ اندلس میں کسی حد تک معاملہ اس سے مختلف رہا، لیکن اس کے سقوط کے بعد جو لوگ وہاں سے نکلے، انھیں ہماری عثمانی سلطنت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ ان کو پناہ ملی تو یورپ میں ملی۔ اس سے تاریخ کا رخ بدل گیا۔ دنیا کی قیادت و سیادت کی باگ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔

اصل میں اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو کارخانہ بنا رکھا ہے، یہ جس طرح اخلاقی اساسات پر امتوں کی تعمیر کرتا ہے، بالکل اسی طرح توانائی کے ذرائع کی دریافت پر بھی ان کے عروج و زوال کا انحصار ہوتا ہے۔ چنانچہ دانش سرا کے تحت ہم نے اپنے سامنے بنیادی طور پر یہی چیزیں رکھی ہیں کہ لوگوں میں اخلاقی اساسات کے استحکام پر محنت کی جائے جس سے یہ امت بحیثیتِ مجموعی محروم ہو چکی ہے۔ اس کے منڈیوں میں کام کرنے والے، اس کے دفتروں میں کام کرنے والے، اس کے اربابِ اقتدار، سب اس سے محروم ہو چکے ہیں۔ اخلاقی اساسات یعنی دیانت، امانت، رواداری، برداشت، لوگوں کے باہمی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تعلقات میں ناگزیر اخلاقیات کو اگر محکم نہیں کیا جائے گا تو جو چاہے کر لیں، قوم دنیا کے اندر سر اٹھا کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔

اس کے لیے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ لوگوں کا قرآنِ مجید کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کیا جائے، اسے پڑھنے کے لیے ان کے اندر رغبت پیدا کی جائے۔ انھیں احساس ہو کہ کیا نعمت ہے جو انھیں دی گئی ہے۔ اس کے لیے قرآنِ مجید اور احادیث کا ایک انتخاب کر کے لوگوں کو دیا جائے اور یہی دانش سرا کا اصل لٹریچر قرار پا جائے۔

دوسری چیز یہ کہ امت کے اندر جو قومی ادارے قائم ہیں، خواہ وہ معاشی ادارے ہوں، خواہ وہ سیاسی ادارے ہوں، خواہ معاشرتی ادارے ہوں، انھیں نئے سرے سے دین کی روشنی میں استوار کرنے کے لیے قوم میں شعور پیدا کیا جائے۔ مکالمے کی ایسی فضا پیدا کی جائے کہ فکری انقلاب کی راہ ہموار ہو۔ ان تمام سوالات کا جواب دیا جائے جو امت کے ذہین عناصر کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ اور خاص طور پر ان چیزوں کو ہدف بنایا جائے جو ہماری ریاست سے متعلق ہیں اس لیے کہ قومی ادارے اسی پر منحصر ہوتے ہیں اور وہی ان کی تشکیل کرتی ہے۔

اس سلسلے میں پس منظر کا کام، اللہ کا شکر ہے کہ ہم کر چکے۔ اب اس کام کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ عام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اس کے لیے ہم سیمینار کریں گے۔ مذاکرے کریں گے۔ اذہان کو مخاطب کریں گے۔ حکمت کے ساتھ، دانش کے ساتھ۔ دین نے ہمیں خدا کی طرف بلانے کے لیے حکمت اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ اسی لیے ہم نے اس کا نام دانش سرا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پیشِ نظر ہے کہ دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے بھی جو رفقا اس کام میں آگے بڑھیں، وہ فعال ہوں۔ اس معاملے میں بھی عام مسلمان کی حیثیت سے جو کچھ ہم کر سکیں، وہ کریں۔

دانش سرا کے یہ مقاصد ہیں جو متعین کیے گئے، جنھیں دستور میں دو اور دو چار کی طرح واضح کر دیا گیا۔ چنانچہ اس موقع پر میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام ایک حد تک مکمل ہو گیا۔ میں نے اس کے بانی کی حیثیت سے یہ سب کام انجام دینے کے بعد اس کی مجلسِ شوریٰ سے درخواست کی کہ میرے علاوہ کسی شخصیت کو اس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے سربراہ کے طور پر منتخب کرے۔ چنانچہ دانش سرا کی مجلسِ شوریٰ نے ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب کا انتخاب کیا ہے۔ اس کنونشن سے وہ اس کی صدارت کی ذمہ داریاں سنبھال رہے ہیں۔ باقی معاملات کنونشن کے دوران میں آتے رہیں گے۔ مجھے اس وقت پس منظر ہی کے لحاظ سے یہ معروضات پیش کرنی تھیں۔

اس کے بعد دانش سرا، پاکستان کے نو منتخب صدر جناب ڈاکٹر محمد فاروق خان نے خطاب کیا۔ دوسرے دن (۲۴ مارچ کو) نمازِ ظہر کے بعد جناب محمد رفیع مفتی نے درسِ قرآن اور جناب طالب محسن نے درسِ حدیث دیا۔ ناشتے کے بعد باہمی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ نمازِ ظہر اور طعام کے بعد دانش سرا کے مختلف شہروں میں قائم حلقوں نے اپنے کاموں کی روداد بیان کی۔ نمازِ مغرب کے بعد بچوں کے رسالے ''آنکھ مچولی'' کے مدیرِ اعلیٰ جناب نعیم احمد بلوچ نے اپنے کام کا تعارف کرایا۔ پھر شہزاد سلیم صاحب نے ''المورد'' کے بارے میں، معز امجد صاحب نے اپنی ویب سائٹ ''انڈرسٹینڈنگ اسلام'' کے

بارے میں، محمد اسحاق صاحب نے مصعب پبلک اسکول کے بارے میں، جناب ڈاکٹر آغا طارق سجاد نے ''دارالاشراق'' کے انتظامی کاموں کے بارے میں حاضرین کے سوالات کے جوابات دیے۔

تیسرے دن (۲۵ مارچ کو) جناب ساجد حمید صاحب نے نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن دیا۔ ناشتے کے بعد ۱۰ بجے جناب جاوید احمد صاحب غامدی نے حاضرین کے مختلف مسائل کے بارے میں سوالات کے جوابات دیے۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر محمد فاروق خان کا اختتامی خطاب ہوا۔ اور یوں نمازِ ظہر اور طعام کے بعد کنونشن اپنے اختتام کو پہنچا۔

دانش سرا کا یہ کنونشن پہلی مرتبہ کراچی میں منعقد ہوا۔ کراچی کے احباب نے اس کے لیے بہت اچھے انتظامات کیے اور شرکا کے آرام اور آسایش کا ہر پہلو سے خیال رکھا۔ دعا ہے کہ خدا ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مے خانہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

میں دیکھتا ہوں فضا ہاے احمریں کی نمود
یہ وقت شام ہے اِس کو بروض گل کہیے
عجب نہیں کہ میسر ہوئی ہے اِس کے طفیل
متاعِ ذوقِ تماشا مرے جنوں کے لیے

بہ پاسِ خاطر احباب سوے مے خانہ
نکل پڑا ہوں تو جوش قدح ہوا ہے سوا
ہر ایک تارِ ربابِ نظر پکار اٹھا
مرے ورود پہ آئی سبو سبو سے صدا

ترا وجود قیامت ہے بزمِ مے کے لیے
رہی ہے تیرہ شبوں میں تجھے سحر کی تلاش
سنی یہ بات تو ساقی نے مجھ سے فرمایا
ترے لبوں سے نہ آئے لب سبو پہ خراش

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

میں جانتا ہوں کہ رندوں کی آرزو تو ہے
مجھے خبر ہے تمنّاے چارسو تو ہے